ماہنامہ

اشراق

لاہور

جولائی ۲۰۱۹ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

''معلوم انسانی تاریخ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت واحد استثنا ہے کہ جس کی بات کو ہم ''کیا'' کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ''کون'' کی بنیاد پر تسلیم کرتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کا فرستادہ اور اُس کا پیغمبر ہے۔ اُس کی زبان سے کلام الٰہی صادر ہوتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہی کہتا ہے جو عالم کا پروردگار اُسے الہام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی بات ہر خطا سے پاک اور ہر غلطی سے مبرا ہوتی ہے۔ جس میں نہ فکر کا تضاد پایا جاتا ہے، نہ خیال کا تناقض و انتشار؛ نہ کلام کا ابہام ہوتا ہے، نہ بیان کا تنزل و ارتقا۔ اُس کا علم تغیرات زمانہ سے متغیر نہیں ہوتا اور حالات کے بدلنے سے بھی اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہی ایک 'کون' ہے جس کا علم کون و مکان کو محیط ہے اور جو لوح بھی ہے اور قلم بھی اور جس کا وجود سراپا 'الکتاب' ہے۔''

—— شذرات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشرو اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد ۳۱ شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۹ء شوال المکرم/ذوالقعدہ ۱۴۴۰ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

فی شمارہ 50 روپے
سالانہ 500 روپے
رجسٹرڈ 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک

سالانہ 50 ڈالر

فہرست

شذرات

علم کا مسئلہ ''کون'' یا ''کیا''؟ (۲) — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: المؤمنون ۲۳: ۱۲- ۲۲ (۲) — جاوید احمد غامدی — ۷

مقالات

قرآن و سنت کا باہمی تعلق: اصولی مواقف کا ایک علمی جائزہ (۷) — محمد عمار خان ناصر — ۱۲

نقد و نظر

ختم شد (۲) — رضوان اللہ — ۱۶

فوکس، احتساب — محمد ذکوان ندوی — ۴۴

سیر و سوانح

حضرت علی رضی اللہ عنہ (۷) — محمد وسیم اختر مفتی — ۴۷

اصلاح و دعوت

شکر گزاری کا مزاج — محمد تہامی بشر علوی — ۷۸

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

علم کا مسئلہ ''کون'' یا ''کیا''؟

(۲)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معلوم انسانی تاریخ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت واحد استثنا ہے کہ جس کی بات کو ہم ''کیا'' کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ''کون'' کی بنیاد پر تسلیم کرتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کا فرستادہ اور اُس کا پیغمبر ہے۔ اُس کی زبان سے کلام الٰہی صادر ہوتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہی کہتا ہے جو عالم کا پروردگار اُسے الہام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی بات ہر خطا سے پاک اور ہر غلطی سے مبرا ہوتی ہے۔ جس میں نہ فکر کا تضاد پایا جاتا ہے، نہ خیال کا تناقض و انتشار؛ نہ کلام کا ابہام ہوتا ہے، نہ بیان کا تنزل وارتقا۔ اُس کا علم تغیرات زمانہ سے متغیر نہیں ہوتا اور حالات کے بدلنے سے بھی اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہی ایک 'کون' ہے جس کا علم کون و مکان کو محیط ہے اور جو لوح بھی ہے اور قلم بھی اور جس کا وجود سراپا 'الکتاب' ہے۔ یہ سب اگر حق ہے، اور یقیناً حق ہے تو پھر علم و عقل کا تقاضا ہے کہ اُس کی ہر بات کو مبنی بر حق مانا جائے اور اُس کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔

اس ایک 'کون' کے علاوہ تمام بنی نوع انسان بھی کسی ایک بات یا کسی ایک موقف پر جمع ہو

جائیں تو اُس کے رد و قبول کا فیصلہ 'کیا' ہی کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ یہ تمام 'کون' مل کر بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں کر سکتے کہ اُن کی بات کو پرکھے بغیر قبول کیا جائے۔ اُس میں غلطی اور صحت، دونوں امکانات کو تسلیم کیا جائے گا۔ وہ الگ الگ ہیں یا من حیث المجموع ہیں، اُن سے صادر ہونے والے ہر علم و فکر کو 'کیا' ہی کی میزان میں تولا اور اُسی کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔

صحیح علمی رویہ یہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کا عام طریقہ یہی ہے کہ وہ کسی قول، کسی علم، کسی فکر کے رد و قبول اور تائید و تردید کا فیصلہ ''کیا'' ہی کی بنیاد پر کیا کرتے ہیں؟ اِس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ لوگوں کی اکثریت اپنے علم و عمل کی بنیاد 'کیا' کے بجاے 'کون' ہی پر رکھتی ہے۔ کبھی یہ کون بخاری و مسلم اور ابو حنیفہ و شافعی ہوتے ہیں اور کبھی غزالی و ابن عربی، شاہ ولی اللہ و اقبال اور مودودی و غامدی ہوتے ہیں۔ اِن کی باتیں صحیح بھی ہوتی ہیں اور غلط بھی۔ ہم آہنگ بھی ہوتی ہیں اور اُن میں تناقض اور تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ اِن کا علم زمانے سے مغلوب اور حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ تغیر و تبدل اور ترقی و تنزل اِن کے افکار کا جزو لازم ہے۔ ہم اِن سب کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں، مگر اِس کے باوجود اِن سے متاثر ہوتے اور اپنے علم و فکر کی محدودیت کی وجہ سے اِن کی بات کو قبول کرنے اور اُس کی پیروی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ اگر کوئی غلطی کرتے ہیں تو اِن سے متاثر ہونے کی وجہ سے ہم بھی اُس غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات اِس کا خمیازہ قوموں اور نسلوں تک کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ ایک حقیقت واقعہ ہے اور اِس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ مسئلہ اِس حقیقت واقعہ کو چیلنج کرنے کا نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اِن علما اور قائدین کی غلطیوں سے ہونے والے نقصان کو کیسے کم سے کم کیا جائے؟ اِس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہماری ساری نظر 'کیا' پر رہنی چاہیے۔ لوگوں کو یہ تعلیم و تربیت دینی چاہیے کہ وہ اِن کی ذات کو پیش نظر رکھنے کے بجاے اِن کی بات کو پیش نظر رکھیں اور اُس میں غلطی اور صحت کا جائزہ لیتے رہیں۔

'کون' اور 'کیا' کی بحث میں یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں 'کون' کے افراد اکثریت میں ہوں تو پھر بھی 'کیا' ہی کو بنیاد بنانا چاہیے؟ یعنی مثال کے طور سائنس، ادب، تاریخ، مذہب کے ماہرین فن کی اکثریت اگر کسی سائنسی، ادبی، تاریخی یا مذہبی نظریے کی درستی پر یقین رکھتی ہے تو کیا اُس کے درست ہونے پر یقین نہیں کر لینا چاہیے؟ میرے نزدیک 'کون' اور 'کیا' کا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ تقابل درست نہیں ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو مختلف اپروچز اور مختلف زاویہ ہاے نظر ہیں۔ 'کون' کو بنیاد بنائیں تو افراد پیش نظر ہوتے ہیں اور 'کیا' کو بنیاد بنائیں تو بات کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ تاہم یہ نکتہ اپنی جگہ درست ہے کہ جب معیار 'کون' ہو گا تو تعداد کو لازماً اہمیت دی جائے گی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کے بغیر فصل نزاع نہیں ہو سکتی۔ نزاعات کا فیصلہ کرنے اور معاملات کو آگے بڑھانے کے لیے اکثریت کی راے کو فیصلہ کن ماننا ناگزیر ہے۔ مگر اکثریت کی تائید کسی بات کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ڈاکٹروں کے بورڈ کی اکثریت اگر آپریشن کا فیصلہ کرتی ہے، ججوں کے بنچ کی اکثریت سزا کا حکم لگاتی ہے، سائنس دانوں کی اکثریت کسی نظریے مثلاً نظریۂ ارتقا پر یقین رکھتی ہے تو بلاشبہ اکثریت ہی کے فیصلوں کو قبول کیا جائے گا، لیکن یہ اکثریت اور یہ قبولیت اُن کی صحت کو لازم نہیں کرے گی۔

یہی معاملہ مہارت فن کا بھی ہے۔ کسی شخص کی فنی مہارت اُسے ہمارے لیے لائق اعتماد اور قابل قبول بناتی ہے، مگر صحت کو لازم نہیں کرتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی ماہر فن کی بات خلاف حقیقت اور کسی غیر ماہر فن کی بات قرین حقیقت ہو۔ گویا کسی بات کے صحیح ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ اُسے کسی ماہر فن نے پیش کیا ہے، بلکہ دلیل اور استدلال ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

اب آخری سوال یہ ہے کہ جب ہم 'کون' کے بجاے 'کیا' کو بنیاد بنائیں، یعنی شخصیت کے بجاے اُس کی بات پر غور کرنے کا طریقہ اختیار کریں تو اُس بات کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کس معیار پر کیا جانا چاہیے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اِس معاملے میں ہمیں لا محالہ اُن فطری اساسات، اُن عقلی مسلمات، اُن اخلاقی اصولوں، اُن دینی مقدمات اور اُن تاریخی شواہد کو بنیاد بنانا ہو گا جن پر ہم پہلے سے یقین رکھتے اور جنھیں ہر لحاظ سے درست سمجھتے ہیں۔ کسی بات کو پرکھنے کا اِس کے سوا کوئی اور راستہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المؤمنون

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ

(تمھارے منکرین اِس کو نہیں مانتے[۱۳۹] تو دیکھیں کہ) ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا تھا[۱۴۰]۔ پھر اُس کو (آگے کے لیے) ہم نے پانی کی ایک (ٹپکی ہوئی) بوند بنا کر ایک محفوظ ٹھکانے

۱۳۹۔ یعنی اِس بات کو نہیں مانتے کہ لوگ مرنے کے بعد جی اٹھیں گے اور وہاں ایمان والوں کے لیے کوئی جنت بھی ہو گی۔

۱۴۰۔ یعنی ابتدا میں، جب انسان زمین کے پیٹ میں اُنھی مراحل سے گزر کر پیدا ہوا جن سے وہ اب ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے۔ دوسری جگہ اشارہ ہے کہ مٹی کا یہ جوہر، جس کا ذکر یہاں ہوا ہے، پانی کی آمیزش سے وجود میں آیا جس سے وہ سڑے ہوئے گارے کی صورت اختیار کر گئی۔ پھر یہ گارا انڈے کے خول کی طرح اوپر سے خشک ہو گیا تا کہ نشو و نما کے مختلف مراحل سے گزر کر جب انسان کا حیوانی وجود پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو یہ خول ٹوٹے اور نک سک سے درست پورا انسان اُسی طرح اُس سے باہر نکل آئے، جس طرح بعض جانوروں کے بچے اب بھی انڈوں سے نکلتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مَّكِيْنٍ ﴿١٣﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا
الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ
اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿١٤﴾ ؕ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿١٥﴾ ؕ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿١٦﴾

میں رکھ دیا[141]۔ پھر پانی کی اُس بوند کو ہم نے ایک لوتھڑے کی صورت دی اور لوتھڑے کو گوشت کی ایک بندھی ہوئی بوٹی بنایا اور اُس بوٹی کی ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔ پھر ہم نے اُس کو ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا[142]۔ سو بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا[143]۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس کے بعد تم کو لازماً مرنا ہے۔ پھر یہ کہ قیامت کے دن تم لازماً اٹھائے بھی جاؤ گے[144]۔ ۱۲-۱۶

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۴۱۔ یہ دوسرے مرحلے کا ذکر ہے جس کے بعد انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا شروع ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں۔ اِس کی جو تفصیل آگے بیان ہوئی ہے، وہ معلوم و معروف ہے۔ دور جدید کا انسان اپنے مشینی مشاہدات کی بدولت اِس کی جزئیات تک سے واقف ہو گیا ہے۔ قرآن کا اعجاز ہے کہ اُس نے صدیوں پہلے جو کچھ کہا تھا، وہ حیرت انگیز طور پر اُس کے مشاہدات کے عین مطابق ثابت ہوا ہے۔

۱۴۲۔ یعنی اُس کے حیوانی وجود کی تکمیل کے بعد اُس میں روح پھونکی اور اُسے چیزے دیگر بنا دیا جسے اب انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہو۔

۱۴۳۔ یہ اُس تاثر کا بیان ہے جو انسان کی خلقت کے اِن تمام مراحل پر غور کرنے والوں کی زبان پر لازماً آنا چاہیے۔ آیت میں 'أفعل' کا صیغہ جمع کی طرف مضاف ہے، لہٰذا تفضیل و ترجیح سے مجرد ہو کر محض کمال صفت کو بیان کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ 'أفعل' کا یہ استعمال عربی زبان میں معروف ہے۔ اِس میں قرآن کے کسی طالب علم کو کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے۔

۱۴۴۔ یہ وہ اصل مدعا ہے جس کے لیے مخاطبین کو اُن کی پیدایش کے اِن تمام مراحل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿١٧﴾ وَاَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ ۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿١٨﴾

اور (یہی نہیں)، ہم نے تمھارے اوپر تہ بہ تہ سات آسمان[145] بنائے ہیں اور ہم اپنی مخلوقات سے غافل نہیں ہوئے[146]۔ اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی برسایا[147]، پھر اُس کو زمین میں ٹھیرادیا[148] اور ہم (اگر چاہتے تو) اُس کو واپس بھی لے جا سکتے تھے۔

''... اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے؟ کیا یہ ساری تدریج و تکمیل اور ساری تربیت و نگہداشت محض اندھے بہرے مادے کی کارفرمائی ہے؟ کیا یہ تمام قدرت و حکمت اور تمام ربوبیت و رأفت بالکل بے مقصد و غایت ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی نتیجہ اور انجام نہیں ہے؟ کیا جو پانی کی ایک بوند کو آدمی بنا سکتا ہے، وہ اُس آدمی کو مرنے کے بعد زندہ نہیں کر سکتا؟ یہی سوالات ہیں جن کے جواب میں نادانوں نے، اگرچہ وہ فلسفی اور سائنس داں کے معزز ناموں ہی سے موسوم ہوں، اختلاف کیا ہے۔ قرآن نے اِنھی سوالوں کے جواب کے لیے انسان کو خود اُس کے وجود کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اِن کے جواب کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، خود اپنے وجود کے مراحل پر غور کرو، ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔''

(تدبرقرآن ۵/۳۰۴)

۱۴۵۔ اصل میں 'سَبْعَ طَرَآئِقَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'طَرَآئِق' 'طَرِيْقَة' کی جمع ہے۔ یہ طبقے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ قرآن نے یہاں صفت بول کر موصوف مراد لیا ہے۔ چنانچہ اِس کا مفہوم وہی ہے جو دوسری جگہ 'سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا' کے الفاظ سے ادا فرمایا ہے۔

۱۴۶۔ یعنی اُس کو پیدا کر کے بھول نہیں گئے، بلکہ برابر اُس کی پرورش اور نگہداشت کا اہتمام کر رہے ہیں۔

۱۴۷۔ یہ اُس پانی کا ذکر ہے جس کو اللہ تعالیٰ سمندروں سے اٹھا کر فضا میں لے جاتے اور پھر بارش کی صورت میں برسا دیتے ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک خاص اندازے اور مقدار کے ساتھ برسایا جاتا ہے، الّا یہ کہ خود اِس کا برسانے والا ہی اِس کو لوگوں کے لیے تنبیہ و تہدید یا عذاب بنا کر اِس کے دہانے کسی وقت کھول دے۔

۱۴۸۔ اِس لیے کہ ذخیرہ ہو کر وہ تمام مخلوقات کے کام آتا رہے۔ یہ خدا ہی کی عنایت ہے، ورنہ اِس کی ایک بوند بھی زمین پر نہ ٹک سکتی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَاَنۡشَاۡنَا لَکُمۡ بِہٖ جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ ۘ لَکُمۡ فِیۡہَا فَوَاکِہُ کَثِیۡرَۃٌ
وَّمِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَیۡنَآءَ تَنۡۢبُتُ بِالدُّہۡنِ
وَصِبۡغٍ لِّلۡاٰکِلِیۡنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ
بُطُوۡنِہَا وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ کَثِیۡرَۃٌ وَّمِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَیۡہَا وَعَلَی

پھر اِسی سے ہم نے تمھارے لیے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اگائے ہیں۔ اِن میں تمھارے لیے بہت سے میوے ہیں جن سے تم لذت اندوز ہوتے ہو[۱۴۹] اور اِنھی سے اپنی غذا کا سامان بھی کرتے ہو۔ اِسی طرح وہ درخت[۱۵۰] بھی اگایا ہے جو طور سینا سے نکلتا ہے۔ وہ روغن لیے ہوئے اگتا ہے اور (روغن کی صورت میں) کھانے والوں کے لیے ایک اچھا سالن بھی[۱۵۱]۔ اور تمھارے لیے چوپایوں میں بھی یقیناً بڑا سبق ہے[۱۵۲]۔ ہم اُن چیزوں کے اندر سے جو اُن کے پیٹ میں ہیں[۱۵۳]، تمھیں (خوش ذائقہ دودھ[۱۵۴]) پلاتے ہیں اور تمھارے لیے اِن میں بہت سے دوسرے فائدے بھی ہیں[۱۵۵] اور تم اِنھی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہو، اور اِن پر اور کشتیوں پر (جو سمندر

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

۱۴۹۔ آیت میں یہ الفاظ تقابل کے اسلوب پر حذف کر دیے گئے ہیں۔

۱۵۰۔ یعنی زیتون، طور سینا جس کی پیداوار کا خاص علاقہ تھا۔

۱۵۱۔ اصل میں لفظ 'صِبۡغ' آیا ہے۔ اِس کی تنکیر اِس کی خوبی پر دلالت کر رہی ہے۔ یعنی 'صبغ طیب للاٰکلین'۔ اہل عرب میں یہ روغن بہت مقبول تھا اور وہ مکھن کی طرح اِسے ایک لذیذ اور مقوی سالن کے طور پر بھی استعمال کرتے تھے۔ اہل کتاب کے بارے میں معلوم ہے کہ اُن کے ہاں اِس کو ایک قسم کے مذہبی تقدس کا درجہ بھی حاصل تھا۔

۱۵۲۔ آیت میں اِس کے لیے 'عِبۡرَۃ' کا لفظ ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔

۱۵۳۔ اِس اجمال کو دوسری جگہ کھول دیا ہے کہ اِس سے پیٹ کے اندر کا گوبر اور خون مراد ہے۔

۱۵۴۔ یہ 'نُسۡقِیۡکُمۡ' کا دوسرا مفعول ہے۔ دوسری جگہ اِس کو 'لَبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ' کے الفاظ سے ظاہر فرما دیا ہے۔

۱۵۵۔ یہ دوسرے فوائد بھی معلوم و معروف ہیں۔ انسان اِن سے سواری اور بار برداری کا کام لیتا رہا ہے۔ یہ

الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ﴿٢٢﴾

میں چلتی ہیں)[۱۵۶]، سوار بھی کیے جاتے ہو[۱۵۷]۔ ۱۷-۲۲

زراعت اور کاشت کاری میں اُس کی معاونت کرتے رہے ہیں۔ اِن کے گوشت، چمڑے اور اون، یہاں تک کہ اِن کے گوبر سے بھی وہ آج تک فائدہ اٹھا رہا ہے۔

۱۵۶۔ اونٹ کے لیے سفینۂ صحرا کا استعارہ بہت پرانا ہے۔ قرآن نے اِسی بنا پر اُس کا اور سفینۂ دریا کا ذکر یہاں ایک ساتھ کیا ہے۔

۱۵۷۔ اوپر انسان کی خلقت کا ذکر ہوا۔ اُس سے امکان معاد کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا۔ اُس کے بعد اُن چیزوں کو لیا ہے جن سے کائنات میں ربوبیت کا اہتمام و انتظام ظاہر ہوتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”یہاں اصل حقیقت پر نگاہ رہے کہ مقصود اِن چیزوں کے ذکر سے درس عبرت ہے کہ کیا جس رب نے ہماری ایک ایک ضرورت کا اِس جزرسی کے ساتھ اہتمام فرمایا ہے، اُس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہم کو پیدا کر کے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے؟ کیا اُس کی یہ ربوبیت ہمارے اوپر کوئی حق اور ذمہ داری عائد نہیں کرتی؟ اور کیا اِس کا لازمی تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اِن ذمہ داریوں سے متعلق ہم سے پرسش ہو؟ جنھوں نے اِن کا حق ادا کیا ہو، وہ انعام پائیں، جنھوں نے اِس دنیا کو ایک بازیچۂ اطفال سمجھ کر ساری زندگی بطالت میں گزاری ہو، وہ اُس کی سزا بھگتیں۔ ظاہر ہے کہ عقل و فطرت کی شہادت اِسی دوسرے پہلو کے حق میں ہے۔ جو لوگ کریم کے دروازے سے سب کچھ پا کر اُس کا حق نہیں پہچانتے یا اُس کے ماسوا دوسروں کے گن گاتے ہیں، وہ لئیم اور ناشکرے ہیں اور لازم ہے کہ وہ اپنی اِس ناشکری کا انجام دیکھیں۔“(تدبر قرآن ۵/۳۰۷)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد عمار خان ناصر

قرآن وسنت کا باہمی تعلق

اصولی مواقف کا ایک علمی جائزہ

(۷)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امام شافعی کے موقف کی الجھنیں اور اصولی فکر کا ارتقا

امام شافعی کے موقف کی وضاحت میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ ان سے پہلے کتاب وسنت کے باہمی تعلق کی بحث میں جمہور اہل علم کے استدلال کا محوری نکتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت کا مطلق اور حتمی ہونا تھا اور وہ قرآن اور حدیث میں کسی ظاہری مخالفت کی صورت میں حدیث کو قرآن کی تشریح میں فیصلہ کن حیثیت دینے کو اس اتباع واطاعت کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کرتے تھے۔ امام شافعی نے اس بحث میں ایک نہایت اہم نکتے کا اضافہ کیا کہ قرآن میں اسلوب عموم میں بیان کیے جانے والے ہر حکم کا ہر ہر فرد اور ہر ہر صورت کو قطعی طور پر شامل ہونے کا مفروضہ ہی عربی زبان کے اسالیب کے لحاظ سے درست نہیں اور قرآن کا اسلوب عموم خود ایک قابل احتمال اور محتاج تفسیر چیز ہے، اس لیے کسی حدیث میں، ظاہر قرآن پر کسی اضافے یا کسی تخصیص و تقیید کو قرآن کے معارض سمجھنے کے بجائے اسے شارع کی طرف سے اصل حکم ہی کی تفصیل اور تشریح تصور کرنا ضروری ہے۔

اسلوب عموم کی نوعیت پر گفتگو کرتے ہوئے امام شافعی نے قرآن مجید کی بہت سی مثالوں کی روشنی میں یہ

واضح کیا کہ عموم کا اسلوب بذات خود قطعی طور پر یہ طے نہیں کرتا کہ متکلم کی مراد عموم ہی ہے، بلکہ اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں اور متکلم کی مراد متعین کرنے کے لیے اضافی دلائل وقرائن کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض جگہ عموم کے اسلوب سے فی الواقع عموم ہی مراد ہوتا ہے، یعنی الفاظ کی ظاہری دلالت جن مصداقات کو شامل ہے، وہ سب متکلم کی مراد ہوتے ہیں، بعض جگہ عموم کے اسلوب سے عموم مراد تو ہوتا ہے، لیکن قرائن ودلائل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عموم سے فلاں اور فلاں صورتیں خارج ہیں، اور بعض مقامات پر عموم کے اسلوب سے سرے سے عموم مراد ہی نہیں ہوتا، بلکہ کچھ خاص مصداقات کا ذکر عموم کے الفاظ سے کر دیا جاتا ہے۔

اس بنیادی نکتے سے امام شافعی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب اسلوب عموم سے واقعتاً عموم کا مراد ہونا قطعی نہیں، بلکہ اس کا تعین اضافی دلائل وقرائن کی روشنی میں کیا جاتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے نمایندے اور ترجمان کی حیثیت سے قرآن کی مراد کی جو وضاحت فرمائی ہے، وہ مراد الٰہی کی تعیین میں حتمی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ سنت میں تخصیص وارد ہونے کے بعد قرآن کے حکم کو اس کے ساتھ ملا کر سمجھا جائے گا اور دونوں کے مجموعے سے اللہ تعالیٰ کی مراد طے کی جائے گی، نہ کہ سنت کے حکم کو کتاب اللہ سے اختلاف پر محمول کر کے حدیث کو رد کر دینے یا منسوخ تصور کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

یہ طرز استدلال اختیار کر کے امام شافعی نے بنیادی طور پر جمہور اہل علم کے موقف، جو اس وقت تک عموماً اطاعت رسول کے اعتقادی مقدمے پر مبنی تھا، دلالت کلام کے تناظر میں ایک علمی وعقلی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی اور بہت سی مثالوں میں سنت میں وارد تخصیصات کے لفظی یا عقلی قرائن کی نشان دہی خود قرآن مجید میں کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ سنت نے قرآن کے حکم میں تبدیلی نہیں کی، بلکہ اسی میں موجود اشارات، علل اور قرائن کی روشنی میں مراد الٰہی کی وضاحت کی ہے۔ اس حد تک امام شافعی کا استدلال بہت وزنی اور مضبوط معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ قبول کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں پاتے کہ جہاں بہت سی مثالوں میں تخصیص کی بنیاد خود قرآن میں واضح کی جا سکتی ہے، وہاں کم وبیش اتنی ہی مثالوں میں حکم کی تخصیص کا کوئی قرینہ بظاہر قرآن میں دکھائی نہیں دیتا، البتہ امام صاحب کے نزدیک چونکہ اصولی طور پر یہ بات طے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تعالیٰ ہی کی مراد کو واضح کرتے ہیں، اس لیے انھیں اصرار ہے کہ ایسی مثالوں کو بھی نسخ اور تغییر نہیں، بلکہ تبیین وتوضیح ہی تصور کرنا لازم ہے۔ یوں کم سے کم اس دوسری نوعیت کی مثالوں کی حد تک ان

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

کا استدلال دلالت کلام کے نکتے سے ہٹ کر دوبارہ ایک طرح کی اعتقادی بنیاد پر استوار ہو جاتا ہے۔

مزید برآں امام صاحب اس الجھن کا بھی کوئی واضح جواب نہیں دیتے کہ کتاب اللہ کے جن احکام میں ظاہراً ایک سے زیادہ احتمالات نہیں پائے جاتے اور تخصیص کا بھی کوئی قرینہ موجود نہیں، ان میں اگر سنت، کتاب اللہ سے مختلف کوئی بات بیان کرے تو اسے اصل حکم میں ترمیم یا اضافہ سمجھنے کے بجاے اس کی تبیین ماننے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ قرآن کا جو حکم پہلے بالکل واضح اور غیر محتمل تھا، سنت کا بیان سامنے آنے کے بعد اب اسے محتمل اور محتاج بیان تصور کیا جائے گا۔ یعنی کسی حکم کے واضح اور غیر محتمل ہونے کا معیار خود اس کا اپنا اسلوب اور اس کی داخلی دلالت نہیں، بلکہ اس کا تعین کسی دوسری امکانی وضاحت کے وارد ہونے یا نہ ہونے پر منحصر ہے۔ ایسی کوئی ممکنہ وضاحت سامنے نہ آنے تک حکم کو عبوری طور پر واضح اور غیر محتمل مانا جا سکتا ہے، لیکن جیسے ہی کوئی وضاحت وارد ہو گی، یہ فرض کر لیا جائے گا کہ اصل حکم محتمل الدلالۃ اور غیر قطعی تھا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ امام شافعی باصرار یہ کہتے ہیں کہ اصل کلام کو اس تخصیص کے لیے قابل احتمال ہونا چاہیے جو بعد میں بیان کی گئی ہے، لیکن وہ یہ واضح نہیں کرتے کہ قرآن وسنت کے باہمی تعلق کے تناظر میں اس قید کا عملی فائدہ کیا ہے، کیونکہ وہ کوئی ایسی مثال بیان نہیں کرتے جس میں سنت کی بیان کردہ تخصیص اصل کلام کے لیے قابل احتمال نہ ہو۔ ان کے فریم ورک میں قرآن کے بیان کا تخصیص کے لیے قابل احتمال ہونے یا نہ ہونے کا سوال سنت سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، کیونکہ سنت میں وارد تخصیص ہی دراصل یہ طے کرتی ہے کہ قرآن کا بیان محتمل ہے یا نہیں۔ ایسی صورت میں اصل کلام کے کسی تخصیص کے لیے قابل احتمال ہونے یا نہ ہونے کا نکتہ کیا فرق پیدا کرتا ہے، اس کی کوئی وضاحت امام شافعی نہیں کرتے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام شافعی اس سوال سے بھی کوئی تعرض نہیں کرتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل حکم کے مبنی بر خصوص ہونے کا علم کیسے ہوا؟ آیا اس کا علم آپ کو مستقل وحی کے ذریعے سے دیا گیا یا سابقہ حکم ہی میں اس کے دلائل و قرائن موجود تھے؟ اگر حکم کے خاص ہونے کے لسانی یا عقلی قرائن خود قرآن میں موجود تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھی قرائن وشواہد سے یہ بات اخذ کی تو زبان کی ابانت وبلاغت یہ تقاضا کرتی ہے کہ تخصیص کے ان قرائن کا فہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص نہ ہو، بلکہ زبان کا معیاری اور عمدہ ذوق رکھنے والے اصحاب علم بھی ان قرائن کی مدد سے اسی نتیجے تک پہنچ سکیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام میں تو اس تخصیص کے قرائن نہیں رکھے تھے، لیکن حکم کے مبنی بر خصوص ہونے کی وضاحت کسی الگ وحی کے

ذریعے سے کی گئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کلام کے مدعا و مفہوم کے ابلاغ کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ کیا قرآن کی زبان اس کی متحمل نہیں تھی کہ اس تخصیص کے قرائن یا اشارات کو اپنے اندر سمو سکتی؟ اس معروف اور مانوس طریقے کو چھوڑ کر ایک ایسا انداز اختیار کرنے کی حکمت کیا ہو سکتی ہے جو الجھن پیدا کرنے کا موجب ہو؟

امام شافعی کے استدلال کے یہ وہ خلا تھے جن کے پیش نظر ان کے بعد ان کے موقف سے اصولی اتفاق کرنے والے مکتب فکر، یعنی جمہور اصولیین میں اس حوالے سے دو مختلف رجحانات سامنے آئے۔ ان میں سے ایک رجحان کا نمایندہ پانچویں صدی ہجری کے ممتاز ظاہری فقیہ علامہ ابن حزم الاندلسی کو قرار دیا جا سکتا ہے، جب کہ دوسرے رجحان کی نمایندگی جمہور اصولیین کے مواقف میں ہوئی ہے۔ ان دونوں رجحانات میں امام شافعی کے پیش کردہ موقف اور استدلال میں بعض اہم تنقیحات اور اضافے شامل ہوئے ہیں جنھیں پیش نظر رکھنا بحث کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[باقی]

رضوان اللہ

ختم شد

(۲)

۲۔ ایمان ہی نجات کی دلیل ہے

ہمیں عدل پر قائم ایک ہستی کی طرف سے امتحان میں مبتلا کیا گیا ہے، اس لیے یہ بات لازم قرار پائی ہے کہ آخرت میں کامیابی کا مکمل انحصار ہمارے اپنے کمائے ہوئے اعمال پر ہو۔ بلکہ رسولوں کے اتمام حجت کے بعد برپا ہونے والی عدالت میں بھی نجات کا یہی معیار برقرار رکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں رنگ، نسل یا اس طرح کی کسی بھی غیر کسبی شے کو ہرگز استثنا نہیں دیا گیا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ از اول تا آخر، یہی اصول اپنی پوری شان سے کارفرما ہے۔ مثال کے طور پر، حضرت نوح اپنی قوم کو دعوت دیں یا اُنھیں تنبیہ کریں۔ نجات کی دعا کریں یا عذاب کی درخواست کریں۔ خدا اپنے عذاب کا فیصلہ سنائے یا نجات پانے والوں کا بیان کرے۔ کامیابی کا مژدہ سنائے یا ناکام ہونے والوں پر لعنت کا بیان کرے؛ اس طرح کے ہر موقع پر ایمان و کفر، توحید و شرک، رسول کی معیت اور اس کی تکذیب ہی کا صراحت سے ذکر ہوا ہے[19]۔ اور یہی

۱۹۔ ان تمام تصریحات کے لیے ترتیب سے یہ آیات دیکھ لی جا سکتی ہیں: 'اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ط اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ' (ہود ۱۱: ۲۶)۔ 'وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ' (ہود ۱۱: ۴۲)۔ 'وَنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ' (الشعراء ۲۶: ۱۱۸)۔ اور 'وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا' (نوح ۷۱: ۲۸)۔ 'رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

وجہ ہے کہ جب کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا گیا تو اس وقت بھی حضرت نوح سے فرمایا ہے کہ وہ صرف اور صرف ایمان والوں کو اس میں سوار کریں۔

اب اس طرح کے محکم اور صریح اصول میں بھی اگر کوئی صاحب رخنہ پیدا کر دینا چاہیں تو اس میں شک نہیں کہ وہ یہ سب کچھ کر گزرنے میں آزاد ہیں، مگر لازم ہے کہ اِس کے لیے وہ خدا کی کتاب میں سے بہت ہی واضح نص لے کر آئیں۔ اور یہ ان پر اسی طرح سے لازم ہے جیسا کہ مثال کے طور پر، زمین و آسمان پر صرف ایک خدا کی خدائی قائم ہے اور انسانوں میں انسان ہی رسول بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ اب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ کسی سیارے پر اُس کے سوا کوئی دوسرا خدا بھی حکومت کرتا ہے اور فرشتوں کو بھی کبھی کبھار انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیج دیا جاتا ہے تو ظاہر ہے، اس طرح کا استثنا لانے کے لیے اسے بڑی ہی مضبوط دلیل چاہیے ہو گی۔ لیکن ان حضرات کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت نوح کے اہل و عیال کو جب نجات کے قانون سے مستثنیٰ قرار دینے کی کوشش کی تو اس کے لیے کوئی صریح اور واضح نص ہر گز پیش نہیں کی، بلکہ حسب معمول یہ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں اور اسی سے اپنا کام نکال لینا چاہتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

"استثنا" کی دلیل

ان کی پیش کردہ دلیل یہ ہے:

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

"ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں —— اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔"

دَيَّارًا'(نوح ۷۱: ۲۶)۔ 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ'(ہود ۱۱: ۳۷)۔ 'فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ'(الاعراف ۷: ۶۴)۔ 'اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ'(ہود ۱۱: ۴۹)۔ 'وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ' (ہود ۱۱: ۴۴)۔

آیت کو بار بار پڑھ کر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس میں نجات کے عمومی اصول سے کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا اور حضرت نوح سے قطعاً یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اہل و عیال کو ایمان کے بغیر اور محض اپنے اہل ہونے کی بنیاد پر کشتی میں سوار کرا لیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کو ایک اشارہ پیدا کر کے اسی پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔ ان کے لفظوں میں آیت میں سے ''یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ حضرت نوح کے اہل خانہ کو محض اُن کے اہل ہونے کی بنا پر بھی سوار ہونے کی اجازت تھی۔'' اس لیے کہ یہاں ''مَنْ اٰمَنَ' کا عطف 'اَهْلَكَ' سے مغایرت کا تقاضا کرتا ہے۔'' اور ''ایمان کے بجاے رشتہ داروں کی طرف دلالت کرتا ہے۔'' اس بات کی تائید میں انھوں نے ایک اور آیت میں سے 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کے الفاظ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''جب آپ کا بیٹا کشتی میں سوار ہونے سے روک دیا گیا[20] تو اس وقت یہی کہا گیا کہ وہ آپ کے اہل میں سے نہیں ہے، جب کہ اگر اہل خانہ کے لیے ایمان کی شرط ہوتی تو کہا جاتا کہ وہ ایمان والوں میں سے نہیں ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مغالطے

غور کیا جائے تو ان کی طرف سے بیان کردہ دو عدد ''اشاروں'' میں کم سے کم چار عدد مغالطے پائے جاتے ہیں:

۱۔ مغایرت کا مطلب یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں ہر لحاظ سے مغایرت پائی جائے گی۔

۲۔ مغایرت کس اعتبار سے ہے، اس کا فیصلہ معطوف کے لحاظ سے کیا جائے گا۔

۳۔ اس آیت میں 'اَهْلَكَ' سے مراد نوح کے سب گھر والے ہیں۔

۴۔ دوسری آیت کے جملے 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' میں بھی 'اَهْلِكَ' مطلق طور پر آیا ہے اور اس سے مراد نوح کے سب گھر والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح میں غرق ہونے والا شخص حضرت نوح کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔

ازالہ

ان مغالطوں کا ازالہ کرنے کے لیے ذیل کی چند باتیں سامنے رہنی چاہییں:

۱۔ اس میں شک نہیں کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان میں مغایرت بھی ہوتی ہے، مگر اس سے یہ

۲۰۔ معلوم نہیں یہ قرآن کی کس آیت میں بیان ہوا ہے کہ نوح کے بیٹے کو کشتی میں سوار ہونے سے روک دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان حضرات کے ہاں موجود اکتیسویں پارے کی کوئی آیت ہو۔

لازم نہیں آتا کہ ان دونوں میں کوئی ایک بات بھی مشترک نہ ہو گی اور وہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہو جائیں گے۔ مثلاً، اس آیت میں فرمایا ہے:

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۷۰) ’’انھوں نے بے اختیار کہا: ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے ہیں۔‘‘

یہاں ’مُوْسٰى‘ کا لفظ ’هٰرُوْنَ‘ پر عطف کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں آپس میں متغایر ہیں، مگر جان لیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے غیر ہوتے ہوئے بھی بہت سے پہلوؤں سے بالکل ایک جیسے ہیں، جیسا کہ انسان ہونے کے ناتے اور اسلام پر قائم ہونے اور خدا کا پیغمبر ہونے کے لحاظ سے۔ زیر بحث آیت کی بھی یہی نوعیت ہے۔ ’وَمَنْ اٰمَنَ‘ اس آیت میں ’وَاَهْلَكَ‘ پر عطف ہوا ہے، اس لیے یہ بات تو طے ہے کہ جن دو گروہوں کا اس میں ذکر ہوا ہے، وہ ایک دوسرے کے غیر ہیں، مگر اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ یہ اپنے اوصاف میں ہر لحاظ سے مختلف ہیں، یہاں تک کہ اسلام اور کفر کے معاملے میں بھی۔

۲۔ ان حضرات کے مطابق عطف کی یہ مغایرت معطوف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی لیے انھوں نے ’وَاَهْلَكَ‘ کے معطوف علیہ میں ’وَمَنْ اٰمَنَ‘ کے معطوف کی وجہ سے یہ معنی پیدا کر دیا ہے کہ یہاں نوح کے اہل کا ایمان اب زیر بحث نہیں رہا۔ دراں حالیکہ اصل اصول یہ ہے کہ یہ مغایرت معطوف کے بجائے معطوف علیہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی، جو بات پہلے بیان کی جاتی ہے، اس کے بعد آنے والی بات اسی کے لحاظ سے غیر اور مختلف سمجھی جاتی ہے کہ یہی کلام کی ترتیب اور اُس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ مثال کے لیے ذیل کی آیت دیکھ لی جائے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ. (الانعام ۶: ۱۹) ’’اور میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں خبر دار کروں اور انھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔‘‘

اس آیت میں ’كُمْ‘ معطوف علیہ ہے اور اس کے مطابق مغایرت اس طرح سے بنتی ہے کہ ’’اس کے ذریعے سے میں تمھیں خبر دار کروں اور تمھارے علاوہ اُنھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔‘‘

اسی طرح زیر بحث آیت کا معاملہ ہے۔ اس میں ’وَاَهْلَكَ‘ معطوف علیہ ہے، چنانچہ اس کی روشنی میں ہم اس کے معطوف یعنی ’وَمَنْ اٰمَنَ‘ کی مغایرت بیان کریں گے جو یہ بنے گی کہ ’’اے نوح، اپنے گھر والوں کو

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اور انھیں جو تیرے گھر والے تو نہیں ہیں، مگر ایمان لائے ہوئے ہیں، اپنی کشتی میں سوار کرا لو۔''

صحیح اصول جان لینے کے بعد اب ان حضرات کے خود ساختہ اصول کو بھی دیکھ لیا جائے کہ اس کے نتیجے میں مغایرت کے نام سے کیا کچھ مضحکہ خیزیاں وجود میں آسکتی ہیں۔ مثال کے لیے پہلی آیت کے ترجمہ پر دوبارہ سے نظر ڈال لی جائے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ. (الانعام ۶:۱۹)

''اور میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کروں اور انھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔''

یہ اس کا سیدھا اور صاف مطلب ہے، مگر ان کے اصول کے مطابق 'وَمَنْۢ بَلَغَ' یہاں اس بات کا قرینہ ہو گا کہ 'كُمْ' میں ابلاغ کا معنی نہیں رہا، اس لیے اب اس کا مطلب ہو گا کہ ''اس قرآن کے ذریعے سے میں تمھیں خبردار کروں کہ جنھیں یہ نہیں پہنچا اور انھیں بھی جنھیں یہ پہنچے۔''

بلکہ زیر بحث پوری آیت کا مطلب بھی دیکھ لیا جائے کہ وہ کیسی عجیب صورت اختیار کر لیتا ہے: ''اے نوح، تم ان سب جانوروں کو جو تیرے گھر میں نہیں رہے اور اپنے اُن گھر والوں کو جو ابھی تک ایمان نہیں لائے اور ایمان والوں کو اپنے ساتھ کشتی میں سوار کرا لو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۳۔ ان کا کہنا ہے کہ زیر بحث آیت میں 'اَهْلَكَ' سے مراد حضرت نوح کے تمام اہل و عیال ہیں اور جہاں تک ان کے صاحب ایمان ہونے کا تعلق ہے تو ''یہاں لفظوں میں کوئی قرینہ ایمان کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔''

اس پر ہم عرض کریں گے کہ انھیں لاحق ہونے والا یہ بھی ایک صریح مغالطہ ہے۔ اس لیے کہ 'اَهْلَكَ' پر تو دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ واضح طور پر 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کے الفاظ آئے ہوئے ہیں۔ اور یہ الفاظ چونکہ مخصص کے طور پر آئے ہوئے ہیں، اس لیے یہ کسی صورت ممکن نہیں رہا کہ اسے مطلق رہنے دیا جائے اور نوح کے سب اہل کے معنی میں لے لیا جائے۔ بلکہ اُن کے اہل میں سے اب صرف وہ لوگ مراد ہو سکتے ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا، یعنی وہ شرک سے بچے ہوئے اور ایمان لے آئے ہوئے لوگ ہیں[21]۔

۴۔ ایک آیت میں 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کا جملہ نقل ہوا ہے۔ ان حضرات کو مغالطہ ہوا ہے کہ اس

۲۱۔ بلکہ ایک دوسرے مقام پر آنے والے 'وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' کے الفاظ بھی اس کے ساتھ ملا لیے جائیں تو یہ تخصیص اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ المومنون ۲۳: ۲۷۔

میں آنے والا لفظ 'اَهۡلِكَ' مطلق طور پر استعمال ہوا ہے، اس لیے غرق ہونے والے شخص کے بارے میں جب کہا جائے گا کہ وہ نوح کے اہل میں سے نہیں ہے تو اس کا مطلب ہو گا کہ وہ حضرت نوح کا حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ اس مغالطے کے ازالے کے لیے آیت میں آنے والے 'اَهۡلِكَ' کو بھی اس کے سیاق میں رکھ کر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے۔ اس سلسلۂ کلام میں یہ لفظ پہلے آیت ۴۰ میں آیا ہے اور وہاں اس کا استعمال اپنے عموم کے بجائے تخصیص میں ہوا ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل گزری۔ سو اس میں پائی جانے والی یہی تخصیص ہے جو اِعادۂ معرفہ کے اصول پر اس واقعہ کے تفصیلی بیان میں آخر تک موجود رہی ہے، حتیٰ کہ مذکورہ جملے 'اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ' میں بھی یہ مکمل طور پر قائم ہے۔ یہ تخصیص اگر سمجھ لی جائے تو اب دو باتیں بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں بھی 'اَهۡلِكَ' سے مراد نوح کے سب گھر والے نہیں، بلکہ ان میں سے صرف وہ لوگ مراد ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا، یعنی وہ نجات پانے والے لوگ ہیں۔ دوسرے یہ کہ 'اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ' کے اس جملے کا مطلب اب یہ نہیں ہو سکتا کہ اے نوح، وہ غرق ہونے والا شخص تمھارے خاندان کا فرد نہیں تھا۔ بلکہ اس کا مطلب ہو گا کہ وہ تمھارے خاندان کے اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو خدا کے عذاب سے نجات پا جانے والے تھے۔

باقی رہا اس شخص کی ابنیت کا معاملہ تو اس کے لیے مذکورہ آیت کے بجائے اُس مقام کو دیکھ لینا زیادہ مناسب ہے جس میں خداے علام نے نہایت واضح الفاظ میں اُسے نوح کا بیٹا قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے:

وَهِيَ تَجۡرِيۡ بِهِمۡ فِيۡ مَوۡجٍ كَالۡجِبَالِ ۟ وَنَادٰى نُوۡحُ ِۨابۡنَهٗ. (ہود ۱۱: ۴۲)

''وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی موجوں کے درمیان اُن کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''

''استثنا'' کا رد

نجات کے عمومی معیار میں استثنا لانے کی کوششوں کا رد ہم نے دو طریقوں سے کیا ہے۔ ایک یہ واضح کر کے کہ ان حضرات کے بیان کردہ استثنا کے حق میں کوئی بھی صریح نص موجود نہیں، بلکہ اگر کوئی چیز اس کے پیچھے ہے تو وہ تہ در تہ مغالطوں کی ایک دنیا ہے۔ دوسرے یہ بتا کر کہ قرآن میں ایجابی طور پر واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت نوح کے اہل کے معاملے میں بھی نجات کا عمومی قانون کارفرما رہا اور اُن کا فیصلہ بھی محض اہل ہونے کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اُن کے ایمان اور کفر کی بنیاد پر کیا گیا۔ اس ذیل میں ہم نے دو آیات کو پیش کیا ہے:

پہلی آیت

ارشاد ہوا ہے:

فَاِذَا جَآءَ اَمۡرُنَا وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ فَاسۡلُكۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ وَاَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ مِنۡهُمۡ ۚ وَلَا تُخَاطِبۡنِىۡ فِى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۚ اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ. (المومنون ۲۳: ۲۷)

''پھر جب ہمارا حکم آجائے اور طوفان ابل پڑے تو اس میں ہر قسم کے جانوروں کے جوڑے رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے لوگوں کو بھی سوار کرا لو، ان میں سے سوائے ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے اور مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہ کہنا جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ وہ لازماً غرق ہو کر رہیں گے۔''

آیت کے اجزا کے بارے میں چند باتیں ملحوظ رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ آیت میں 'سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد اصل میں مشرکین کے بارے میں سنادیا گیا فیصلہ ہے کہ جس کے مطابق وہ خدا کے عذاب کی لپیٹ میں آ کر رہیں گے۔

دوسرے یہ کہ آیت میں آنے والے 'اَهۡلَكَ' سے مراد خاندان نوح کے افراد ہیں۔ اور مومنین کے عمومی لفظ کو چھوڑ کر اسے لایا گیا ہے تو اس کی وجہ علی سبیل التغلیب کا اسلوب ہے۔ اس اسلوب کا استعمال یہاں اس لیے کیا ہے کہ حضرت نوح پر زیادہ تر آپ کے خاندان کے لوگ ایمان لائے تھے، اس لیے مومنین کے اس معتد بہ حصے کا بیان کر دیا تو گویا سب مومنین کا بیان کر دیا گیا۔

اجزا کی وضاحت کے بعد آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ حضرت نوح نے اپنی قوم کے ایمان سے ناامید ہو کر جب اپنے خدا سے دعا کی تو اُنھیں حکم ہوا کہ ایک کشتی ہمارے سامنے اور ہماری ہدایت کے مطابق تیار کرو۔ پھر جب فیصلے کا وقت آجائے اور طوفان ابل پڑے تو 'فَاسۡلُكۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ'۔ اس میں اپنی ضرورت کے تمام جانوروں کے جوڑے رکھ لینا۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'وَاَهۡلَكَ'۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی اس میں سوار کرا لینا۔ کشتی میں سوار ہونے کا مطلب اصل میں خدا کے عذاب سے نجات پانا تھا اور وہ صرف ایمان والوں کا نصیب تھی، اس لیے آپ سے خصوصاً فرمایا گیا: 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَيۡهِ الۡقَوۡلُ مِنۡهُمۡ' کہ اپنے خاندان میں سے اُن افراد کو ہرگز اس میں سوار نہ کرانا جو ایمان والے نہ ہوں اور اس وجہ سے اُن پر خدا کا فیصلہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صادق آ چکا ہو۔ اس کے بعد یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ تمھارے خاندان میں سے جو لوگ تم پر ایمان نہ لائیں، وہ ظالم ہیں، اس لیے 'وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا'۔ ان ظالموں کی ہم دردی اور سفارش میں ہم سے کوئی بات نہ کہنا۔ 'اِنَّھُمْ مُّغْرَقُوْنَ'، وہ بہر صورت غرق کر دیے جائیں گے۔

دوسری آیت

قُلْنَا احْمِلْ فِیْھَا مِنْ کُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَھْلَکَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْہِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ط وَمَآ اٰمَنَ مَعَہٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

"ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوا اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں — اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔"

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس آیت کے اجزا کے بارے میں بھی چند چیزیں جان لینی چاہییں:

ایک یہ کہ اس میں 'وَمَنْ اٰمَنَ' کو 'اَھْلَکَ' پر عطف کیا گیا ہے۔ یہ عام بعد الخاص کی نوعیت کا عطف ہے اور تعمیم کے لیے آیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ کشتی میں سوار کرنے کے حکم کا دائرہ خاندان سے باہر کے مومنین کو بھی محیط ہو گیا ہے۔ یعنی، اس کا مطلب اب یہ ہے کہ اے نوح، تم نہ صرف اپنے گھر والوں، بلکہ دوسرے مومنین کو بھی اس کشتی میں سوار کرا لو۔

دوسرے یہ کہ آیت میں 'اَھْلَکَ' پر 'اِلَّا' کے ذریعے سے تخصیص لائی گئی ہے۔ یہ جس پر آتی ہے اُس کے بعض افراد کو چونکہ اُس میں سے خارج کر دیتی ہے، اس لیے یہ بات طے ہے کہ اس لفظ میں اب نوح کے خاندان کے سب افراد شامل نہیں رہے، بلکہ اُس کے بعض افراد، لامحالہ اِس میں سے خارج ہو گئے ہیں۔ اور مزید یہ کہ خاندان کے افراد ہونے کے باوجود، اس لیے خارج ہو گئے ہیں کہ وہ مشرک ہیں اور خدا کے فیصلے کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ 'اَھْلَکَ' کے اندر یہ تخصیص ایک اور طرح سے بھی پیدا ہوئی ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اس پر آنے والا 'مَنْ اٰمَنَ' کا عطف ایک ہی وقت میں جس طرح یہ بتا رہا ہے کہ وہ 'اَھْلَکَ' کا غیر ہے، اسی طرح اپنے اندر موجود ایمان کا ایک رنگ بھی اس میں پیدا کر رہا ہے۔

اجزا کی وضاحت کے بعد اب آیت کا مفہوم بڑی آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اصل میں اُس موقع کا بیان ہے جب عذاب کا وقت قریب آن لگا ہے اور نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ضرورت کے تمام جانوروں کے جوڑے کشتی میں رکھ لیں۔ یہ جانور غیر ذوی العقول ہیں اور اس دنیا میں برپا کیے گئے امتحان سے قطعی طور پر لاتعلق ہیں، اس لیے اُن میں سے کون سا جوڑا رکھا جائے، اس کا پیمانہ یہی ہونا چاہیے کہ وہ جانور ہوں اور اُن کی ضرورت کے جانور ہوں۔ اس کے بعد فرمایا ہے: 'وَاَهْلَكَ' اور اس کے ساتھ اپنے اہل کو بھی سوار کرا لیں۔ اُن کے اہل ہم جانتے ہیں کہ ذی شعور انسان ہیں اور اس وجہ سے دنیا میں برپا ہوئے امتحان سے گزر رہے ہیں، اس لیے ان میں سے کون سوار کیا جائے، اس کا فیصلہ ان کے اہل ہونے کے بجائے ان کی اہلیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ سب لوگ آپ کی رسالت کے بھی براہ راست مخاطب ہیں، اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان میں سے صرف ایمان والے کشتی میں سوار کرائے جائیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہوئی کہ 'اَهْلَكَ' پر 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' لا کر اس بات کو بالکل صراحت کے ساتھ بھی بیان کر دیا گیا۔ یعنی، 'اِلَّا' کی اس تخصیص سے بتا دیا کہ اُن کے اہل میں سے صرف صاحب ایمان کشتی پر سوار ہو سکیں گے اور جو شرک پر قائم ہیں اور اس طرح خدا کے فیصلے کی زد میں آ چکے ہیں، وہ سوار ہونے سے یک سر محروم رہیں گے۔ اس کے بعد 'اَهْلَكَ' پر 'مَنْ اٰمَنَ' کا عطف لایا گیا ہے۔ اس عطف نے جس طرح دیگر مومنین کو بھی اس حکم میں شامل کر لیا ہے، اسی طرح ایک زائد قرینہ اس بات کا بھی فراہم کر دیا ہے کہ 'اَهْلَكَ' سے مراد یہاں صرف مسلمان اہل ہیں۔ اس لیے کہ اس سیاق میں عطف کے ان الفاظ کا صحیح مطلب بنتا ہے: ''اور دوسرے ایمان والے بھی''۔ اور غور سے دیکھا جائے تو یہ ''دوسرے'' کا مفہوم بھی اصل میں 'اَهْلَكَ' کے اندر ایمان والوں کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اعتراضات

دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیتیں اس معاملے میں بالکل قطعی ہیں کہ نوح علیہ السلام کے خاندان کا فیصلہ بھی اسلام کے عام قانون نجات کے مطابق ہی ہوا اور کسی بھی شخص کو محض اُن کے اہل ہونے کی بنیاد پر رتی بھر کوئی رعایت نہیں دی گئی۔ مگر ان آیتوں کی ہماری طرف سے پیش کردہ وضاحت پر ان حضرات کی طرف سے کچھ اعتراضات کر دیے گئے ہیں:

۱۔ کہا گیا ہے کہ ہم نے مختلف مقامات پر ایک ہی لفظ اور ایک ہی آیت کے مختلف تراجم کیے ہیں۔ مثلاً، اگر 'ذُرِّيَّتَهُمْ' سے کبھی ''اولاد آدم'' مراد لی ہے اور کبھی ''ان کی نسل''، تو اسی طرح 'وَمَنْ اٰمَنَ' کا ترجمہ ایک

جگہ یہ کیا ہے: ''اور ان کو بھی جو ایمان لائے ہیں۔'' اور ایک مقام پر اس میں لفظ ''دوسرے'' کا اضافہ کرتے ہوئے یوں ترجمہ کیا ہے: ''اور دوسرے مومنین کو سوار کرا لو۔''

کسی لفظ اور آیت کو ایک سے زیادہ طریقوں سے ترجمہ کرنا نہ تو غلط ہے اور نہ یہ رائے میں ''متلون'' مزاج ہونے کا غماز ہے۔ لفظوں کے چناؤ میں اصل معیار جس طرح مترجم کا فہم اور اُس کا ذوق انتخاب ہوتا ہے، اسی طرح وہ مقاصد بھی اس میں معیار ہوتے ہیں جنھیں سامنے رکھ کر یہ ترجمہ کیا جا رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، کبھی مترجم آیت کا لفظی ترجمہ کرنا چاہتا ہے اور کبھی سلیس اور بامحاورہ۔ کبھی وہ آیت کی نحوی تالیف بتانا چاہتا ہے تو کبھی وہ اس میں پائے جانے والے کسی خاص پہلو کی وضاحت اور اسی طرح کے دیگر مقاصد کے پیش نظر ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے، یہ سب ترجمے مختلف الفاظ میں کیے جائیں گے، مگر اس کے باوجود یہ سب ایک ہی آیت کے اور بالکل صحیح ترجمے ہوں گے۔ سو اسی طرح کا معاملہ ان مقامات کا ہے جن پر یہ حضرات معترض ہو بیٹھے ہیں۔ ''اولاد آدم'' اور ''ان کی نسل'' یہ اصل میں 'ذُرِّیَّتَهُمْ' کے دو مختلف ترجمے نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی مدعا کی اردو زبان میں دو مختلف تعبیرات ہیں۔ گویا مترجم کے ہاں یہ دونوں مترادفات ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''ان کی نسل'' سے ''ان انسانوں کی نسل'' مراد لے رہا ہے۔ اسی طرح 'وَمَنْ اٰمَنَ' کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک مقام پر ''دوسرے'' کا جو اضافہ کیا گیا ہے تو اس سے مقصود فقط اس لفظ کی وہاں موجودگی کی صراحت کر دینا ہے [۲۲]، وگرنہ یہ اُس جگہ بھی موجود ہے، جہاں عربی اسلوب کی موافقت میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

باقی ان کا یہ اعتراض کرنا کہ اس ''دوسرے'' کے لیے عربی متن میں کوئی لفظ موجود نہیں ہے تو اس پر ہم بتانا چاہیں گے کہ قرآن کریم کی عربی میں اس طرح کے الفاظ کبھی صراحت سے ذکر کر دیے جاتے ہیں اور کبھی ذکر تو نہیں کیے جاتے، مگر کلام کی ساخت اور اُس کی دلالت سے آپ سے آپ سمجھ لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک مقام پر اس کے لیے ''اُخَرَ'' کا لفظ لاتے ہوئے فرمایا ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. (البقرہ ۲: ۱۸۴)	''پھر جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔''

مگر ذیل کی آیت میں اسے ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا:

۲۲۔ یہی وجہ ہے کہ اہل نظر مفسرین بھی بعض اوقات اسے لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں، جیسا کہ صاحب الکشاف نے اس موقع پر لکھا ہے: یعنی: 'واحمل اهلك والمومنين من غيرهم'۔

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ. (آل عمران ۳: ۸۴)

''اور جو چیز موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دی گئی۔''

یہاں یہ عربی متن میں موجود نہیں ہے، مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے باوجود یہ ہر طرح سے واضح ہے، اور قرآن کے طالب علموں کو تو گویا بول بول کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔

بلکہ ہم عرض کریں کہ بعض الفاظ تو ایسے بھی ہیں کہ جن کے لیے عربی زبان کا کوئی لفظ پورے قرآن میں ایک مرتبہ بھی استعمال نہیں ہوا، جیسا کہ ''بھی'' کا لفظ، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اہل علم اپنے ترجموں میں اسے بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ شاید یہ بھی ہوتی ہے کہ انھیں اس بات کا بالکل ڈر نہیں ہوتا کہ کوئی معترض صاحب اس معاملے میں بھی اعتراض کر دیں گے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر عربی متن میں سے اس کا متبادل دکھا دینے کی ضد بھی کریں گے۔

۲۔ ہم نے 'اَھْلَکَ' پر 'مَنْ اٰمَنَ' کے عطف کو بیان کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ ان دونوں کی مغایرت کو بیان کر رہا ہے۔ یہ بھی بتایا تھا کہ یہ عام بعد الخاص کا عطف ہے اور تعمیم کے لیے آیا ہے۔ مزید یہ بھی بتایا تھا کہ یہ 'اَھْلَکَ' میں ایک طرح کی تخصیص بھی پیدا کر رہا ہے۔ ایک ہی عطف سے اس قدر متنوع استدلال کر دکھانے پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خوب خوب داد دی جاتی یا کچھ اور نہیں تو اس طرح کی چیزوں پر آیندہ سے غور کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا، اُلٹا یہ اعتراض کر دیا گیا ہے کہ شاید ہمارے پاس کوئی ''جادوئی عطف'' ہے جو ایک ہی وقت میں یہ سارے کام کر لیتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس طرح کے ''جادوئی عطف''، ہم عرض کریں کہ بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان حضرات کو دکھائے بھی جا سکتے ہیں، شرط بس اتنی ہے کہ یہ ''اکابرین'' کے مقام بلند سے اتر کر کبھی ہم جیسے طالب علموں کی صف میں بھی آ بیٹھیں۔ ہم بطور مثال ایک آیت پیش کیے دیتے ہیں جس میں یہ بخوبی دیکھ سکیں گے کہ عطف کا یہ سارا تنوع بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ. (الحج ۲۲: ۵۲)

''ہم نے اے پیغمبر، تم سے پہلے جو رسول اور جو نبی بھی بھیجا ہے، اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا کہ اس نے جب بھی کوئی تمنا کی، شیطان اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا ہے۔''

یہاں 'رَسُوْل' پر 'نَبِی' کے لفظ کو عطف کیا گیا ہے۔ نبی اور رسول اپنی ذات میں ایک ہی ہوتے اور یہ

دونوں لفظ بارہا ایک دوسرے کے محل میں استعمال کر لیے جاتے ہیں مگر اس عطف نے بتایا ہے کہ یہاں ان میں مغایرت بیان کرنا مطلوب ہے اور یہ دو لفظ اصل میں دو الگ مناصب کے لیے آئے ہیں۔ دوسرے یہ عام بعد الخاص کا عطف ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ نبی کے مقابلے میں رسول خاص ہوتا ہے، یعنی ہر رسول نبی ہوتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اسے تعمیم کی غرض سے لایا گیا ہے تاکہ بتایا جائے کہ آیت میں بیان کردہ معاملہ صرف رسولوں کو نہیں، بلکہ خدا کے نبیوں کو بھی پیش آتا رہا ہے۔ چوتھے یہ کہ معطوف یہاں معطوف علیہ میں ایک تخصیص بھی پیدا کر رہا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ 'رسول' کا لفظ اپنے اطلاق میں رسول، نبی، فرشتے اور سفیر، ان سب کے لیے آ جاتا ہے، مگر اس پر ہونے والے 'نبی' کے عطف نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اس میں تخصیص ہو چکی اور اب یہ صرف رسول کے ساتھ خاص ہو گیا ہے۔

۳۔ جب یہ اعتراض کیا گیا کہ ایک ہی لفظ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مغایرت کے ساتھ ساتھ تخصیص کا باعث بھی ہو جائے تو اس پر ہم نے ایک مثال پیش کر کے انھیں بتایا تھا کہ ایسا بالکل ہو سکتا ہے، اور وہ مثال یہ تھی:

"بیٹا، اپنے ساتھ پاکستانیوں، سوائے ان کے جو بالغ ہو چکے ہیں اور دوسرے بچوں کو بھی ساتھ لیتے آنا۔"

اس پر اب یہ اعتراض کر دیا گیا ہے کہ یہ مثال قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق نہیں ہے اور اس میں کچھ مسائل ہیں۔ مثلاً، آیت میں "دوسرے" کا لفظ نہیں ہے۔ آیت کی ترتیب کے مطابق مثال میں 'بچوں' کا لفظ پہلے آنا چاہیے اور 'پاکستانیوں' کا بعد میں۔ آیت میں عام بعد الخاص کا اسلوب ہے تو مثال میں دونوں جگہ عام لفظ لائے گئے ہیں۔ اور یہ کہ آیت میں 'اهل' کی ضمیر مخاطب کی طرف اضافت ہے اور مثال میں یہ رشتہ موجود نہیں ہے۔

ہم وضاحت کر دیں کہ ہماری طرف سے یہ مثال آیت کا اسلوب سمجھانے کے لیے نہیں، بلکہ اس دعویٰ کو غلط ثابت کر دکھانے کے لیے دی گئی تھی کہ عطف ایک ہی وقت میں مغایرت اور تخصیص کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس مثال سے ہمارا ہدف ہر طرح سے حاصل ہو گیا ہے کہ اس میں پاکستانیوں اور بچوں میں آنے والا عطف مغایرت بھی پیدا کر رہا ہے اور ایک طرح کی تخصیص بھی۔ تاہم، ان لوگوں نے اپنے دعویٰ سے دست بردار ہونے کے بجائے اب یہ نئی بحث اٹھا دی ہے کہ یہ مثال آیت کی ساخت کے خلاف ہے تو لگے ہاتھوں ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور یہ ہر اعتبار سے آیت کے مطابق ہے۔ ہماری دی ہوئی مثال میں اگر "دوسرے" کا لفظ موجود ہے تو یہ آیت میں بھی موجود ہے، جیسا کہ اوپر تفصیل گزری۔ اس کی ترتیب بھی آیت کے بالکل موافق ہے کہ آیت میں پہلے اہل کا ذکر ہوا اور اس کے بعد اُن کا جو اہل نہیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہیں، مثال میں بھی اہل پاکستان کا ذکر ہوا اور بعد میں اُن کا جو پاکستانی نہیں ہیں۔ آیت میں عام بعد الخاص کا اسلوب ہے تو مثال میں بھی دونوں جگہ عام الفاظ نہیں لائے گئے، بلکہ پاکستانی خاص بچوں اور بعد میں عام بچوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح آیت میں اگر 'اھل' کا ضمیر خطاب سے تعلق پایا جاتا ہے تو وہ مثال میں بھی ہر طرح سے موجود ہے۔ وہ اس طرح سے کہ یہ ہم پاکستانیوں کی طرف سے دی گئی اردو کی ایک مثال ہے۔ سو اس میں حکم دینے والا باپ اپنے پاکستانی بیٹے سے مخاطب ہوتے ہوئے جب یہ کہتا ہے کہ پاکستانیوں کو لیتے آنا تو اس میں، ظاہر ہے کہ اُس کے بیٹے اور ان پاکستانیوں کے درمیان میں اہل پاکستان ہونے کا تعلق ہر لحاظ سے موجود ہے۔

اپنی پیش کردہ مثال کو اس کڑے معیار پر جانچ لینے کے بعد اب ہم چاہیں گے کہ ان حضرات کی دی ہوئی مثال کو بھی پرکھ لیا جائے کہ وہ آیت کی ساخت سے کوئی تعلق رکھتی ہے یا اس سے کوسوں دور ہے۔ ہم ذیل میں ان کی دی ہوئی مثال پیش کرتے ہیں اور پوری امید رکھتے ہیں کہ ہماری طرح سب لوگ چاہے آیت اور اس کے درمیان میں کوئی ادنیٰ سی مناسبت نہ ڈھونڈ سکیں، مگر اسے پڑھ کر وہ پورے دل سے سبحان اللہ ضرور کہہ اٹھیں گے۔ وہ مثال بے مثال یہ ہے:

"بیٹا اپنے بچوں کو اور پاکستانی بچوں کو لیتے آنا۔"

۴۔ تخصیص اور مغایرت کے اکٹھا ہو جانے پر ان کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمیں اب مان لینا چاہیے کہ "'اِحۡمِلۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ وَاَهۡلَكَ' کے اس جملے میں 'وَاَهۡلَكَ' کا عطف 'كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ' سے مغایرت بھی کر رہا ہے اور تخصیص بھی کہ العیاذ باللہ 'كُلٍّ زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ' بھی اہل خانہ میں سے تھے۔"

ان کے اس مطالبہ نما اعتراض کے پیچھے دو بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ ایک یہ کہ ہر عطف مغایرت کے ساتھ تخصیص بھی کیا کرتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر کسی جملے میں ایک عطف تخصیص کرے گا تو دوسرا بھی لازماً یہ کام کرے گا۔ یہ غلط فہمیاں اگر دور ہو جائیں تو آپ سے آپ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت میں دوسرے عطف کی بنیاد پر جانوروں کے لیے بھی تخصیص پر اصرار کرنا ایک بے جا مطالبہ ہے۔ بلکہ یہ مطالبہ اس لیے بھی ناروا ہے کہ دوسرے عطف میں تخصیص پیدا ہو جانے کی جو وجوہات ہیں، وہ جانوروں سے متعلق ہر گز نہیں ہو سکتیں۔ مثال کے طور پر، اس میں تخصیص آنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عطف اُس موقع پر بیان ہوا ہے جب عذاب سے نجات پانے والوں کا معیار بیان ہو رہا ہے۔ دوسرے اس کے بعد آنے والے معطوف میں ایمان کے وصف کو نمایاں کرنا ہے۔ تیسری وجہ معطوف پر آنے والا "دوسرے" کا لفظ ہے۔ چوتھی وجہ اس کے بعد 'وَمَآ اٰمَنَ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ‘ کا لایا ہوا جملہ ہے کہ جس میں ایمان ہی زیر بحث آیا ہے۔ اب ظاہر ہے، ان تمام چیزوں کا تعلق صرف اور صرف دوسرے عطف کے ساتھ موزوں ہو سکتا ہے نہ کہ جانوروں کے حکم پر مشتمل پہلے عطف کے ساتھ۔ سو ان لوگوں کو اگر پہلے عطف میں بھی کسی تخصیص کا مطالبہ کرنا ہے تو انھیں جان لینا چاہیے کہ اس کے لیے صرف ''واو'' کو دیکھ لینا یا دوسرے عطف کو بنیاد بنا لینا کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہو گا کہ آیت کے اندر اتر کر کچھ غور و فکر بھی کر لیا جائے اور یوں اس تخصیص کے لیے الگ سے دلائل فراہم کیے جائیں۔

۵۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ ’اَهْلَكَ‘ پر ’اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ‘ کے الفاظ آئے ہیں اور اس بات کی واضح دلیل ہو گئے ہیں کہ اس میں تخصیص واقع ہو چکی ہے اور اس سے اب حضرت نوح کے تمام گھر والے نہیں، بلکہ ان میں سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے بارے میں عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا۔ اس بات کی وضاحت میں ہم نے بیان کیا تھا کہ عربی زبان میں ’قول‘ کا مطلب ''بات'' ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ ’علیٰ‘ کے استعمال نے یہاں دو چیزیں بالکل واضح کر دی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد اب صرف بات نہیں، بلکہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ فیصلہ ’عليه‘ کی ضمیر کے مرجع کے خلاف ہے۔ اس ’قول‘ پر آنے والا الف لام اور اس کے ساتھ فعل ’سبق‘ کا استعمال سامنے رہے تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ پہلے سے سنا دیا ہوا فیصلہ ہے اور مزید یہ کہ اس سے نوح علیہ السلام اچھی طرح سے واقف بھی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ ہے کیا؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ وہی فیصلہ ہے جسے انھوں نے اپنی قوم کے سامنے یہ کہتے ہوئے بیان کر دیا تھا: ’يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ‘۔[۲۳] ''میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا (اُس کے شریک ٹھیرا کر تم اس کے غضب سے) ڈرتے نہیں ہو۔'' ان کی اس دعوت کا مطلب، ظاہر ہے، یہی تھا کہ جو لوگ صرف خدا کی عبادت کرنے کے بجائے اُس کے شریک ٹھیرائیں گے، اُن کے بارے میں خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اُس کے غضب کا شکار ہو کر رہیں گے۔ سو قرآن کے الفاظ اور اس کے سیاق کے لحاظ سے یہی ’سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ‘ کا حقیقی مصداق ہے۔

ہمارے اس طویل استدلال پر ایسا نہیں ہوا کہ ان کی طرف سے کوئی نقد کیا گیا ہو اور ہمیں بتایا گیا ہو کہ ’سبق‘ کے فعل، اُس کے صلے اور لفظ ’قول‘ پر آنے والے الف لام سے یہ معنی پیدا نہیں ہو سکتے، بلکہ ان تمام چیزوں سے کمال بے اعتنائی کرتے ہوئے صرف یہ فرمان سنا دیا گیا ہے کہ ان الفاظ میں ''کافر ہونے کا معنی ڈالنے کے لیے

۲۳۔ المومنون ۲۳: ۲۳۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کلام میں کوئی اشارہ نہیں۔'' طالب علم جان سکتے ہیں کہ دلائل کے مقابلے میں اصرار کرنے کا یہ رویہ علمی دنیا میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس پر مزید کچھ کہنے کے بجاے یہ کرتے ہیں کہ ان الفاظ کا وہ مطلب اب بیان کیے دیتے ہیں جو ان لوگوں کی طرف سے نکالا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''جن اہل خانہ کے بارے میں اللہ نے پہلے کوئی بات کر رکھی ہے۔ وہ کشتی میں سوار نہیں ہوں گے۔ روکنے کی وجہ غیر منصوص ہے، کیونکہ لفظوں میں بیان نہیں ہوئی۔'' ان کے اس مطلب میں دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ جس طرح 'علیٰ' سے صرف نظر کیا گیا اور الف لام کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے، اسی طرح روکنے کی وجہ کو غیر منصوص کہہ کر کشتی میں سوار ہونے کے حکم کو سرے سے نامعقول قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ عقلی طور پر بالکل محال ہے کہ حضرت نوح کو ایک حکم اُس کے استثنا سمیت دیا جائے اور عمل کرتے وقت وہ اُس استثنا سے مکمل طور پر ناواقف ہوں۔ بلکہ اس کے بعد تو انھوں نے قیامت ہی ڈھا دی ہے جب کہا ہے کہ اس جملے کو 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ ان سے پوچھا جائے کہ 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کے الفاظ تو اس بات پر دال ہیں کہ وہ بات پہلے سے بتا دی گئی ہے اور حضرت نوح کے علم میں ہے۔ اس کے مقابلے میں 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کے الفاظ اس سارے واقعہ کے بعد صادر ہوتے ہیں اور یہ صراحت بھی کی جاتی ہے کہ نوح اس میں بیان ہوئی بات کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے۔ اب اس واضح فرق کے ہوتے ہوئے یہ جملہ آخر کس اصول پر 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کی تفسیر قرار دیا جا سکتا ہے؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تفنن طبع کے لیے اس ذیل میں ان کی طرف سے بیان کردہ ایک اور نکتہ بھی دیکھ لینا چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ' کا مصداق ''غیر اہل ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو اہل ہونے کے معیار پر پورا نہیں اترے گا، اسے سوار نہیں کیا جائے گا۔'' ان کے اس تفسیری نکتے کی روشنی میں کہ جو ان کے زعم میں خالص فراہی اصولوں کی روشنی میں مستنبط ہوا ہے، آیت کا مفہوم یہ بن جاتا ہے: ''تم اپنے گھر والوں کو سوار کرا لو۔ البتہ، اپنے ان گھر والوں میں سے انھیں ہر گز سوار نہ کرانا جو تمھارے گھر والے نہ ہوں۔''

۶۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کے جملے سے پہلے ہی 'اَهْلَكَ' میں تخصیص آچکی ہے اور اعادۂ معرفہ کے اصول پر یہ کلام کے آخر تک قائم بھی رہی ہے۔ اس پر اعتراض ہوا ہے کہ اگر اس لفظ میں تخصیص آگئی ہوتی تو اسے اسم ضمیر میں بدلنا چاہیے تھا اور یہ ''جملہ، کلام کی فطرت ہے کہ یوں ہونا چاہیے تھا: 'ان ابنی منہم'۔'' چنانچہ یہاں اعادۂ معرفہ کے بجاے ''اللہ کے الفاظ کو حوالہ بنایا گیا ہے تاکہ بعد کی تفصیلات سے

مجر د رکھا جائے‘‘۔

اس اعتراض میں انھوں نے کئی فنی چیزوں کو خراب کر دیا ہے۔ انھیں درست طریقے سے سمجھنے کے لیے چند باتیں سامنے رہنی چاہییں۔ ایک یہ کہ کلام میں معرفہ کے بعد اس کی ضمیر کا استعمال بھی کیا جاتا ہے، مگر اسے ایک اٹل قاعدہ بنا دینا اور یہ کہنا کہ کلام کی فطرت بہر صورت اس کا تقاضا کرتی ہے، یہ ایک بے جا دعویٰ ہے اور کم سے کم ہمارے جیسے طالب علم اس کی کوئی دلیل ڈھونڈ لانے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔ بلکہ ہم تو قرآن میں بہت سی مثالیں اس کے الٹ دیکھتے ہیں کہ اس میں اسم کا ذکر کیا جاتا ہے جو معرفہ بھی ہوتا ہے اور اس میں تخصیصات بھی آچکی ہوتی ہیں، مگر اس کا ذکر دوبارہ سے کرنا ہو تو بعض وجوہ کے پیش نظر اُسی معرفہ کا اعادہ کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے لیے اس ایک آیت کو دیکھ لیا جائے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ.(العنکبوت ۲۹:۱۲)

’’اور منکرین ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو اور تمھارے گناہ ہم اٹھا لیں، حالانکہ ان کے گناہوں میں سے وہ کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہیں۔‘‘

یہاں ’خَطٰيٰكُمْ‘ میں ’خطایا‘ معرفہ بھی ہے اور اس میں تخصیص بھی واقع ہو چکی ہے کہ اس سے مراد یہاں ایک خاص نوعیت کے گناہ ہیں۔ مگر دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اس کے لیے ضمیر نہیں لائی گئی، بلکہ ’خَطٰيٰهُمْ‘ کے ذریعے سے اسی اسم کو بعینہٖ دہرا دیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ سامنے رہنی چاہیے کہ یہاں اعادۂ معرفہ ہی ہوا ہے اور کسی قول کا حوالہ نہیں دیا جا رہا، جیسا کہ ان لوگوں نے گمان کر لیا ہے۔ اس لیے کہ یہ قول کا حوالہ اُس صورت میں بنتا جب اس میں قول کو دہرایا جاتا۔ یعنی، نوح کہتے کہ اے اللہ، تم نے مجھے اپنے اہل کو سوار کرنے کا حکم دیا تھا تو اس قول کے مطابق میرے بیٹے کو کشتی میں سوار ہونا چاہیے تھا، مگر وہ تو اس میں سوار نہیں ہوا۔ بلکہ قول دہرانے کے بجائے اس میں آئے ہوئے معرفہ کو دہرایا گیا ہے کہ اے اللہ، تم نے سوار کرنے کے حکم میں اہل کا ذکر کیا تھا اور انھیں اس عذاب سے بچ جانا تھا تو میرا بیٹا انھی اہل میں سے ہونے کے باوجود آخر کیوں ہلاک ہوا؟ مگر ہم اس بحث میں پڑنے کے بجائے عرض کرتے ہیں کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ قول کا حوالہ ہے تو اس سے یہ بات کہاں سے لازم آگئی کہ اس کا اعادہ کیا جائے گا تو اب اس میں کوئی تخصیص باقی نہیں رہے گی؟ قرآن میں تو بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مخصص شے کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حوالہ دیا جاتا ہے، مگر اس کا اعادہ کرتے ہوئے یہ لازم نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں پائی جانے والی تخصیصات اب ختم ہو گئی ہیں۔ ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں:

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. ... قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ. قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ. ... قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ. ... قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۶-۲۸)

موسیٰ و ہارون سے فرمایا ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادے ہیں۔ ان کے اس قول میں 'رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' معرفہ بھی ہے اور مخصص بھی۔ اس کے بعد فرعون نے اسی رب کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا ہے کہ مجھے بتاؤ، وہ رب کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا ہے کہ وہ زمین و آسمان کا رب ہے۔ اور اس کے بعد طنز اور استہزا کو نظر انداز کرتے ہوئے بار بار اسی رب کے حوالے سے حقائق کو بیان فرمایا ہے۔ اب ہر طالب علم خود ہی دیکھ لے سکتا ہے کہ یہاں 'رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ' میں پیدا ہو جانے والی تخصیص شروع سے لے کر آخر تک ہر طرح سے موجود رہی ہے اور کہیں بھی اس سے صرف اس وجہ سے مجرد نہیں ہو گئی کہ یہاں کسی ''قول کا حوالہ'' دیا جا رہا ہے۔

۷۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ اللہ کے ہاں طوفان نوح میں غرق ہونے والا شخص حضرت نوح کا حقیقی بیٹا تھا اور اسی لیے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اُس نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں: 'وَنَادٰى نُوْحُ ﹰابْنَهٗ'۔ یعنی، نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ تو حکایت ماجرا ہے، اس لیے یہ اس کے کرداروں کے علم کی رعایت ہے اور اسے حقیقت کا بیان کسی صورت نہیں کہا جا سکتا۔

اس اعتراض کے جواب میں چند باتیں سامنے رہیں: ایک یہ کہ یہ حکایت خدا کی طرف سے ہو رہی ہے، اس لیے لازم ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات ہر گز نہ بیان کی جائے جو واقعہ کے بالکل خلاف ہو۔ دوسرے یہ کہ قرآن کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ حکایت کرتے ہوئے محض لوگوں کے علم کی رعایت سے حقائق کے خلاف کوئی بات کر دی جائے۔ خدا کی طرف سے کہی جانے والی بات کبھی مخاطبین کے مزعومات کے مطابق ہوتی ہے اور بعض اوقات ان کے خلاف بھی ہوتی ہے، مگر یہ طے ہے کہ وہ حقیقت کے خلاف کبھی نہیں ہوتی۔ پہلی صورت کی مثال وہ آیت ہے جس میں فرمایا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا، اور ہم جانتے

ہیں کہ یہ وہ بات ہے جو حضرت ابراہیم کے ہاں بھی مسلم ہے:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا. (مریم ۱۹: ۴۲)

''جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان، آپ ان چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کے کسی کام آسکتی ہیں؟''

دوسری کی مثال وہ آیت ہے جس میں فرمایا ہے کہ منکرین نے اپنے رسولوں سے یہ بات کہی، حالانکہ منکرین کے زعم کے مطابق وہ خدا کے رسول ہر گز نہیں ہیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا. (ابراہیم ۱۴: ۱۳)

''منکروں نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تم کو اپنی اس سرزمین سے لازماً نکال دیں گے یا تمھیں (بالآخر) ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔''

غرض یہ کہ 'وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ' کے الفاظ اللہ کی طرف سے بیان کردہ ہیں، اس لیے لازمی طور پر حقیقت واقعہ پر مبنی ہیں۔ چنانچہ یہ کسی طور جائز نہیں ہے کہ ان پر حکایت ماجرا کے اصول کا اطلاق کر کے اس کی نفی کر دی جائے کہ ایسا کرنا گویا خدا کے الفاظ اور اُس کے علم کی مطلق طور پر نفی کر دینا ہے، اور نتیجے کے اعتبار سے تکذیب کے دروازے کو کھول دینا ہے کہ اب اس اصول کی بنیاد پر جو شخص جب چاہے قرآن میں بیان کردہ کسی بھی حقیقت کا انکار کر دیا کرے۔

یہاں ان حضرات سے ایک سوال بھی پوچھ لینا چاہیے۔ ان کا کہنا کہ یہ بات نوح کے مزعومات کے مطابق کہی گئی ہے جو اسے غلطی سے اپنا بیٹا خیال کرتے تھے، ان سے پوچھنا چاہیے کہ اس اطلاع کا ماخذ ان لوگوں کے پاس آخر ہے کیا؟ اگر یہ کہیں کہ 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کا جملہ اس کا ماخذ ہے تو اول تو ہم کہیں گے کہ یہاں اسے بطور دلیل پیش کرنا انھی کے مانے ہوئے اصولوں کے مطابق صحیح نہیں ہے کہ اس کا معنی ہمارے اور ان کے درمیان میں ابھی زیر بحث ہے۔ دوسرے یہ کہ اس جملے میں بھی یہ کہاں بیان ہوا ہے کہ وہ شخص نوح کا بیٹا نہیں ہے؟ اس میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت نوح کی التجا ہو یا خدا کی طرف سے دیا گیا اس کا جواب ہو، ان دونوں میں اُس شخص کی ابنیت سرے سے زیر بحث نہیں آئی کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے لیے بالکل دوسرے الفاظ لائے جاتے۔ یعنی، حضرت نوح کی دعا کے جواب میں 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کہنے کے بجائے 'انه ليس ابنك' یا 'انه ليس من ابناءك' کہا جاتا کہ اے نوح، وہ تو تمھارا بیٹا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ہم یہاں ایک اور استدلال کرنا چاہیں گے۔ وہ یہ کہ 'اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ' کے جملے میں تو اس کے برعکس، اس بات کا اشارہ

موجود ہے کہ خدا کے ہاں اس شخص کا نسب بالکل حقیقی ہے۔ اس لیے کہ 'اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَھۡلِیۡ' کے بعد جب 'اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَھۡلِکَ' کہا جائے گا تو اس 'اِنَّہٗ' کا مطلب اصل میں 'ان ابنك' ہو گا۔ یعنی، اسے کھول دیں تو اصل عبارت یوں بنے گی: 'ان ابنك ليس من اهلك'۔ بے شک تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اور ہر صاحب علم جان لے سکتا ہے کہ یہ جملہ اُسے نوح کا بیٹا مان لینے کے بعد ہی اُس کے اہل میں سے ہونے کی نفی کر رہا ہے۔

حکایت ماجرا کے تناظر میں 'وَنَادٰی نُوۡحُ ۨ ابۡنَہٗ' کی اس قدر وضاحت کر دینے کے بعد ہمارا خیال ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ ذوالقرنین کی مثال پر اب کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ، ہم طالب علموں کے لیے وہ بنیادی فرق ضرور بیان کیے دیتے ہیں جو ان دو مثالوں میں باہمی طور پر پایا جاتا ہے۔ ذوالقرنین کی مثال میں سورج کو سیاہ چشمے میں ڈوبتے ہوئے دیکھنا انسانی آنکھ کا مشاہدہ ہے اور جس مقام کو سورج کے غروب ہونے کی جگہ کہا گیا ہے، اس کا علم بھی مخاطبین کے ہاں ان کی آنکھوں کے مشاہدے ہی سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ بالکل جائز ہے کہ حقیقت جاننے کے باوجود اس طرح کے مشاہدے کا اعتبار کرتے ہوئے اس کی روایت کی جاسکے۔ مگر اس کے مقابلے میں ابن نوح کے نسب کا حقیقی ہونا یا نہ ہونا، ایسا معاملہ نہیں ہے کہ اس میں ایک بات حقیقت پر مبنی ہو اور دوسری آنکھ کا ظاہری مشاہدہ ہو، بلکہ یہ ایک معنوی معاملہ ہے اور اس میں ایک بات حقیقت ہوتی ہے اور دوسری خلاف حقیقت ہوتی ہے اور قرآن میں کبھی ایسا نہیں ہو گا کہ خدا کی طرف سے کسی خلاف حقیقت بات کی روایت کر دی جائے[24]۔ چنانچہ جو حضرات اس ذیل میں کوئی مثال پیش کرنا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اس طرح کی مثال پیش کریں جس میں خدا کی طرف سے آنکھ کے مشاہدے کے بجاے معنوی لحاظ سے کسی غلط بات کی روایت کی گئی ہو۔

حاصل بحث

اس ساری بحث کو چند نکتوں میں سمیٹ لیا جاسکتا ہے:

۲۴۔ اس فرق کو ایک اور طرح سے بھی سمجھ لیا جاسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ قرآن میں مثال کے طور پر، یہ تو عام بیان ہوتا ہے کہ اللہ بارش برساتا ہے اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی عطا کر دیتا ہے، مگر اس میں کبھی ایسا نہیں ہو گا کہ وہ اپنے مخاطبین کی رعایت سے مثال کے طور پر یہ بیان کر دے: 'وما قتلوا عيسى ابن الله'۔ کہ انھوں نے اللہ کے بیٹے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmedghamidi.com

۱۔ عذاب دنیوی ہو یا اخروی، ہر انسان کے لیے نجات کا معیار اس کا ایمان ہی ہے اور یہ اصول قرآن میں جس طرح عمومی انداز میں بیان ہو گیا ہے، اسی طرح خاص حضرت نوح کے معاملے میں بھی اسے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۔ اس بنیادی اصول میں استثنا لانے کے لیے ضروری ہے کہ محکم درجے کی کوئی نص پیش کی جائے کہ اس ذیل میں محض ''اشارے'' کنایے کسی بھی صورت کفایت نہیں کرتے۔

۳۔ امرأۃ نوح

خدا کے پیغمبر، نہ صرف یہ کہ حسن اخلاق کے داعی ہوتے اور اسی مقصد سے انسانوں کی طرف مبعوث کیے جاتے ہیں، بلکہ وہ خود بھی اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کے منکرین کو بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ اخلاقی حیثیت ہی اُن کی دعوت کی اصل قوت ہے، اس لیے وہ اسے داغ دار کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ ان پر براہ راست الزام لگانے کی کوئی راہ نہ پا سکیں تو ظاہر ہے، ان کا اگلا ہدف اب ان کے ازواج ہی ہوتے ہیں کہ جن پر بہتان تراشی کر کے وہ اپنے مذموم مقاصد کسی نہ کسی درجے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو ہم جانتے ہیں کہ آپ کے مخالفین نے اس مقصد سے پورا زور صرف کیا، مگر خدا کا فیصلہ یہی ہوا کہ انھیں کسی صورت میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے کہ اس میدان میں ان کی کامیابی اصل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی صریح ناکامی ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پروردگار عالم نے خود آگے بڑھ کر آپ کے ازواج کو ان تہمتوں سے بری قرار دیا، یہاں تک کہ مخالفین کی طرف سے اچھالی گئی اس گندگی سے بچانے کے لیے اپنی طرف سے کچھ مخصوص احکام بھی نازل فرمائے۔

اس روشنی میں دیکھا جائے تو اہل علم کی وہ رائے سو فی صد درست لگتی ہے جس کے مطابق انبیاے کرام کے ازواج کافر تو ہو سکتے ہیں، مگر بد چلن اور بد اخلاق ہرگز نہیں ہو سکتے[۲۵]، اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ قرآن اور حدیث کے سارے ذخیرے میں اس طرح کی کوئی بات کہیں نقل نہیں ہوئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے انھی حضرات نے جب اپنا یہ دعویٰ ثابت کر دکھانا چاہا کہ نبیوں کے اہل محض ان کے اہل ہونے پر نجات پا سکتے ہیں تو

۲۵۔ اصحاب رسول میں سے حضرت عباس جیسے اہل علم کی رائے بھی حضرات نوح و لوط کی بیویوں کے متعلق یہی نقل کی گئی ہے کہ انھوں نے بدکاری کا ارتکاب ہرگز نہیں کیا، ابن کثیر۔

www.javedahmadghamidi.org

اس کے لیے انھوں نے ایک استدلال یہ کیا کہ نوح کا بیٹا اسی لیے نجات نہ پا سکا کہ وہ آپ کا حقیقی بیٹا نہیں تھا۔ اور وہ آپ کا حقیقی بیٹا نہیں تھا، اس بات کی وضاحت میں اس کے بعد یہ کہا کہ اُن کی بیوی نے اصل میں بد چلنی کا ارتکاب کیا تھا۔ مگس اور باغ کے جیسے اپنے اس استدلال کے لیے ان لوگوں نے یہاں سے دلیل اٹھائی ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ.(التحریم ۶۶:۱۰)

”اللہ منکروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں، مگر انھوں نے اپنے شوہروں سے بے وفائی کی تو اللہ کے مقابلے میں وہ ان کے کچھ کام نہ آسکے اور دونوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مغالطے

اس آیت میں انبیاے کرام اور ان کے متعلقین کے بارے میں جو امر واقعہ ہے، اس کے خلاف ہرگز یہ بیان نہیں ہوا کہ حضرات نوح و لوط جیسی مقدس شخصیات کے ازواج نے کسی بد چلنی کا ارتکاب کیا۔ بلکہ اس میں صرف یہ کہا گیا ہے ’فَخَانَتٰهُمَا‘ کہ انھوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کا ارتکاب کیا۔ مگر انھوں نے اس خیانت کا مطلب یہاں بد چلنی کر دیا ہے تو اس کی وجہ اصل میں انھیں لاحق ہو جانے والے دو بڑے علمی مغالطے ہیں:

۱۔ خیانت کا عمومی مستعمل معنی بد چلنی ہے اور یہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے ”قرائن فراہم کرنے کا مطالبہ غیر علمی تقاضا ہے۔“

۲۔ ”جب بھی میاں بیوی کی خیانت کا ذکر ہو اور یہ نہ بتایا جائے کہ وہ کس معاملے میں خیانت ہے تو مراد بد چلنی ہی ہو گی۔“

ازالہ

ان مغالطوں کے ازالے کے لیے چند باتیں سامنے رہنی چاہییں:

۱۔ ان کا کہنا کہ بد چلنی اس لفظ کا عمومی مستعمل معنی ہے، یہ ایک صریح مغالطہ ہے کہ لفظ اور اُس کے معنی کی ساری بحث مکمل طور پر سماع پر منحصر ہوتی ہے اور ان کی یہ بات سراسر قیاس اور اندازے پر مبنی ہے۔ اسے ہم

نے قیاس اور اندازہ اس لیے قرار دیا ہے کہ انھوں نے اس "عمومی مستعمل معنی" کے لیے نہ تو اہل زبان کی مراجعت کی ہے اور نہ وہاں سے اس کے شواہد نقل کیے ہیں اور نہ یہ بتایا ہے کہ اہل لغات نے بھی اسے اپنی کتابوں میں ثبت کیا ہے۔ صرف اور صرف ایک راے ہے جو ان کی طرف سے پیش کر دی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے، ان کی راے فقط ان کے کہنے پر تو نہیں مان لی جا سکتی اور خاص کر ہمارے جیسے طالب علم تو اسے کسی صورت نہیں مان سکتے جو خوش قسمتی سے ان پر اور ان کی زبان دانی پر رتی بھر بھی ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں۔

۲۔ میاں بیوی کے تعلق سے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس سے مراد لازمی طور پر بد چلنی ہو گی، اس مغالطے کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ اس میں بھی صرف اور صرف تحکم پایا جاتا ہے، وگرنہ قدیم عربی زبان میں ہماری معلومات کی حد تک اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ مرد و عورت کے تعلق میں بھی بد چلنی کے بجاے اپنے اصل معنی، یعنی امین بنا دینے کے بعد جو ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہوتا ہے، اسے ٹھیس پہنچانے کے لیے آتا ہے۔ اس کے بعد کلام میں پائے جانے والے قرائن ہوتے ہیں جو اس کے مرادی معنی کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ بے راہ روی اور بد چلنی ہے یا کچھ اور ہے۔ پہلی صورت کی مثال میں اُس روایت کو دیکھ لیا جا سکتا ہے جس میں کسی غیر سے تعلق بنانے پر اسے لایا گیا ہے:

وامراة غاب زوجها وقد كفاها مونة الدنيا فخانته بعده.

(ابن حبان، رقم ۴۵۵۹)

"آخرت میں اُس عورت کی کچھ پروا نہ کی جائے گی جس کا شوہر کہیں چلا جائے اور اس کے باوجود کہ اُس نے تمام ضروریات زندگی اسے فراہم کر رکھی تھیں، وہ اُس کی غیر موجودگی میں اُس سے خیانت کرے۔"

دوسری کی مثال اُس روایت میں ہے جس میں یہ آدم و حوا کے لیے استعمال ہوا، مگر صرف اور صرف آدم کی بات نہ ماننے کے لیے آیا ہے:

ولولا حوالم تخن انثى زوجها الدهر.

(بخاری، رقم ۳۳۹۹)

"اگر حوا آدم سے خیانت نہ کرتی تو کوئی عورت اپنے شوہر سے کبھی خیانت نہ کرتی۔"

آیت کا اصل مفہوم

ان مغالطوں کے ازالے کے بعد اب ہم اس آیت کا اصل مفہوم نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ.(التحریم ۶۶:۱۰)

''اللہ منکروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں، مگر انھوں نے اپنے شوہروں سے بے وفائی کی تو اللہ کے مقابلے میں وہ ان کے کچھ کام نہ آسکے اور دونوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔''

آیت میں خیانت کا لفظ آیا ہے اور اپنے اصل معنی، یعنی حضرات نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کی طرف سے اُن کے باہمی اعتماد کو مجروح کرنے پر استعمال ہوا ہے اور اس کی تعبیر کے لیے اردو میں صحیح لفظ ''بے وفائی'' ہے۔ اب اس بے وفائی کی وضاحت میں جب ہم آیت اور اس کے سارے سیاق کو دیکھتے ہیں تو ان عورتوں کی بد چلنی کے لیے ہمیں کوئی ادنیٰ درجے کا قرینہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ، اس میں متعدد قرائن ایسے ضرور پائے جاتے ہیں جو متعین طور پر بتا دیتے ہیں کہ اس خیانت سے مراد ان عورتوں کی طرف سے سرزد ہونے والا کفر ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔ پچھلی آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ آپ کفار اور منافقین پر سختی کریں اور انھیں بتا دیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یہ منکرین کے دو گروہ تھے جن میں سے پہلے اپنی بدعہدیوں اور دوسرے اطاعت و فرماں برداری کا حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے پکے خائن تھے۔ چنانچہ انھیں سمجھانے کے لیے بھی ایک کے بجائے دو عورتوں کی خیانت کی مثال دی ہے، اور اس طرح بتا دیا ہے کہ ان میں سے پہلی نے صریح کفر اور دوسری نے منافقت کرتے ہوئے اپنے شوہر سے یہ خیانت کی ہے۔

۲۔ اس آیت میں کفر کرنے والوں کو اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ انھیں خدا کے عذاب سے لازماً دوچار ہونا ہے اور اس ذیل میں بڑی سے بڑی نسبت بھی انھیں کوئی فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے۔ اس رعایت سے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سمجھانے کے لیے جو مثال دی جائے، اس میں کفر ہی کے جرم پر بتایا جائے کہ اُن سے پہلے نوح و لوط کی بیویوں نے جب اس کا ارتکاب کیا تو وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آکر رہیں اور پیغمبروں کے ساتھ اُن کی نسبتیں بھی انھیں کچھ فائدہ نہ دے سکیں۔

۳۔ یہاں فرمایا ہے: 'وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ'۔ ''اور دونوں کو حکم ہوا کہ جاؤ آگ میں جانے

والوں کے ساتھ تم بھی آگ میں چلی جاؤ۔'' اس سیاق میں 'الدّٰخِلِیْنَ' سے مراد حضرات نوح اور لوط کا کفر کرنے والے ہیں اور اس کی مزید دلیل اس لفظ پر آنے والا الف لام بھی ہے۔ اب ظاہر ہے، ان کفر کرنے والوں کی معیت میں ان کی سزا میں داخل ہونا، اُسی وقت معقول اور عدل کے مطابق ہو سکتا ہے جب مان لیا جائے کہ یہ عورتیں بھی کفر کرنے والی ہیں اور اسی لیے کافروں کی معیت میں ان کی سزا میں داخل ہو جانے والی ہیں۔

۴۔ ان عورتوں کی خیانت پر جو سزا جس طریقے سے اور جس طرح قیامت سے پہلے سنا دی گئی ہے، قرآن کے رمز شناس جان سکتے ہیں کہ یہ محض غیر اخلاقی حرکت کے ارتکاب پر سنائی ہوئی سزا ہر گز نہیں ہو سکتی۔ لا محالہ، اس کی وجہ ان عورتوں کا کفر ہے کہ اس انداز میں کفر کرنے والوں کا انجام بیان ہوا کرتا ہے اور وہ بھی اُن کفر کرنے والوں کا کہ جن پر ہر طرح سے اتمام حجت کیا جا چکا ہو۔

غرض یہ کہ ان قرائن سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں خیانت سے مراد اصل میں ان عورتوں کا کفر ہے۔ سو اب سادہ لفظوں میں آیت کی تفہیم کچھ یوں بنتی ہے:

کفر کرنے والوں کو دو عورتوں کی مثال دی گئی ہے جو حضرات نوح اور لوط علیہما السلام کے عقد میں تھیں۔ یہ عقد چونکہ میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کے لیے امین بناتا اور اس طرح اُن کے درمیان میں ایک طرح کا اعتماد پیدا کر دیتا ہے، اس لیے اُن حضرات کو اپنی بیویوں سے بڑی امید تھی کہ وہ دعوت حق کو سبقت کرتے ہوئے قبول کریں گی اور اس کام میں اُن کی مؤید اور معاون بن کر رہیں گی۔ یہ امید اس لیے بھی بہت زیادہ تھی کہ وہ صرف خدا کے ان نیک بندوں کے عقد میں نہ تھیں، بلکہ ان کی تولیت میں اور ان کے زیر تربیت بھی تھیں۔ 'فَخَانَتٰهُمَا'، مگر انھوں نے اس سب کے باوجود ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی جب سچے دل سے ایمان لانے کے بجائے کفر کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ اپنے اس کفر کی وجہ سے وہ خدا کے عذاب کی گرفت میں آ کر رہیں اور پیغمبروں کے ساتھ اُن کی نسبت بھی اُن کے کچھ کام نہ آ سکی۔

اعتراضات

آیت کے اس مفہوم پر ان لوگوں کی طرف سے چند اعتراضات کیے گئے ہیں:

۱۔ ہم نے لکھا تھا کہ خیانت کے لفظ کا عمومی مستعمل معنی قدیم عربی زبان میں بہر حال بد چلنی نہیں ہے۔ اس پر اعتراض ہوا ہے کہ ان کی بات غلط سمجھی گئی ہے، اس لیے کہ ان کا مطلب تو عمومی مستعمل معنی سے ''صرف یہ تھا کہ یہ جس معنی میں عموماً مستعمل ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قارئین جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے خیانت کے لیے نہ صرف یہ کہ ''عمومی مستعمل معنی'' کی اصطلاح برتی تھی، بلکہ اسے موکد کرنے کے لیے ''پینا'' کے لفظ کو بھی پیش کیا تھا جو ہماری زبان میں اسی کی ایک مثال ہے۔ اس پر ہم نے اپنی گزارشات پیش کر کے بتایا تھا کہ عربی زبان میں خیانت کا اس طرح کا کوئی مستعمل معنی موجود نہیں ہے۔ بہت اچھا ہوتا کہ یہ لوگ ہماری بات کو تسلیم کرتے یا پھر اس پر کوئی تنقید ہی لکھ ڈالتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ایسا تو کچھ نہیں کیا، البتہ، اپنے اس لافانی جملے سے ہمیں مبہوت ضرور کر دیا ہے کہ عمومی مستعمل معنی سے ان کا ''مطلب تو صرف یہ تھا کہ یہ جس معنی میں عموماً مستعمل ہے''[26]۔ اس عجیب و غریب توجیہ پر ہم کسی بحث میں پڑنے کے بجائے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ اگر ان کی مراد مستعمل معنی نہیں ہے تو پھر اس جملے کا مطلب کیا ہے کہ ''جب بھی میاں بیوی کی خیانت کا ذکر ہو اور یہ نہ بتایا جائے کہ وہ کس معاملے میں خیانت ہے تو مراد بد چلنی ہی ہو گی۔'' ہمارے خیال میں یہی تو وہ چیز ہے جسے مذکورہ اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ اگر یہ جملہ عمومی مستعمل معنی کو بیان نہیں کر رہا تو کم سے کم وہ اس جملے کے بارے میں یہ تو بتا دیں کہ اس کی قدیم عربی مصادر میں دلیل کیا ہے؟

۲۔ ہم نے بیان کیا تھا کہ خیانت کو جب مرد و عورت کے حوالے سے لایا جائے تو اس کے لیے اردو میں قریب تر لفظ 'بے وفائی' ہے۔ یہ خیانت کا ہر طرح سے متبادل ہے اور اسی کی طرح کسی خاص معنی میں مستعمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ شوہر کی بات نہ ماننے، اُس کا ساتھ نہ نبھانے، اُسے اکیلا چھوڑ جانے اور کسی غیر سے راہ و رسم بڑھانے، ان سب معانی میں آتا ہے اور اس کے بعد مذکور قرائن ہوتے ہیں جو اس کے مرادی معنی کی تعیین کرتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض نما دعویٰ کیا گیا ہے کہ اردو میں بے وفائی کے لفظ کو جب ''میاں بیوی کے لیے بولا جائے تو بد چلنی ہی کے معنی دے گا، شرط یہ ہے کہ بے وفائی کی وضاحت نہ آ گئی ہو۔''

اردو زبان میں ''بے وفائی'' اپنے اصل معنی اور اپنے اطلاقات میں اس قدر واضح ہے کہ ان کے دعویٰ پر کوئی تنقید کرنے کے بجائے ہم عرض کریں گے کہ اس معاملے میں اردو کے کسی اچھے لغت کی مراجعت کر لی جائے یا کچھ اور نہیں تو اردو شاعری میں اور عام بول چال میں اس لفظ کا متنوع استعمال دیکھ لیا جائے۔ یا کم سے کم اُن مظلوم شوہروں ہی سے پوچھ لیا جائے جنھوں نے کسی اور بات پر نہیں، بلکہ صرف روٹھ کر چلے جانے پر اپنی

۲۶۔ ہمیں وہ صاحب یاد آ گئے جن کے بزرگوں کے بارے میں کسی مخالف نے لکھ دیا کہ وہ سیاہ رنگ کے تھے۔ اس پر انھوں نے اسی طرح کا فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہر گز نہیں، حضرت تو بس گہرے گندمی رنگ کے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بیویوں کو بے وفا قرار دیا اور اس پر وہ کمال درجے کی شاعری کی ہے کہ بخت و نصیب کی طرح اپنے تمام بیاض بھی سیاہ کر لیے ہیں۔

۳۔ ہم نے مذکورہ آیت میں خیانت کے مرادی معنی کی تعیین کے لیے اس کے سیاق و سباق میں سے پورے چار عدد قرائن پیش کیے تھے۔ کوئی نقد کرنے کے بجاے انھوں نے ایک ہی وار میں یہ کہتے ہوئے ان سب کو اڑا دیا ہے کہ یہ محض ''لاطائل تقریریں ہیں''۔ اور اس کے بعد اپنے مخصوص علمی انداز میں کہا ہے کہ اس طرح کی بحثیں ''معنی کے نہیں، بلکہ مدعا کے تعین کے لیے ہوتی ہیں۔'' مثلاً، قرآن میں ''فرشتوں کے سجدے کا ذکر کہیں اسوۂ حسنہ کے بیان کے لیے ہوا اور کہیں فرماں برداری کے لیے۔ لیکن کہیں بھی 'فسجدوا' کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ فرشتوں نے اچھا اسوہ دکھایا یا انھوں نے فرماں برداری کی۔ لیکن یہ مدعاے کلام ضرور ہو سکتا ہے۔''

معلوم نہیں کس جذبے سے ان لوگوں نے اسے مدعا کی بحث قرار دے دیا ہے۔ وگرنہ مدعا اور معنی کی تعیین میں کیا فرق ہوتا ہے، الحمد للہ، اس کی تھوڑی بہت واقفیت ہم بھی رکھتے ہیں اور اسی بنا پر نہایت اعتماد سے طالب علموں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنی بحث میں لفظ خیانت کے مرادی معنی کی تعیین کی ہے جب یہ بتایا ہے کہ اس سے مراد دین کے معاملے میں خیانت ہے کہ جو کفر کے درجہ تک پہنچ گئی ہے، اور ہمیں سو فی صد یقین ہے کہ تمام اہل علم جو اس فرق سے بخوبی واقف ہیں، وہ بھی اسے معنی کی تعیین ہی قرار دیں گے۔ ہماری بحث تو اُس وقت مدعاے کلام کی بحث قرار دی جا سکتی تھی جب ہم نے خیانت کا معنی ''منکرین کو سزا مل کر رہنا'' یا ''نسب کا کام نہ آنا'' بیان کیا ہوتا کہ اس مقام پر یہی وہ مدعا ہے جس کا ابلاغ متکلم کے پیش نظر ہے۔

۴۔ اس کے بعد ان حضرات نے اپنی طرف سے چند قرائن پیش کیے ہیں[۲۷]۔ ان کا کہنا ہے کہ اولاً، 'امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ' اور 'كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ' کے الفاظ کے زیر اثر 'فَخَانَتٰهُمَا' کے الفاظ آئے ہیں۔ ثانیاً، یہاں خیانت کی وضاحت نہیں کی گئی۔ ثالثاً، بعد کی آیت میں سیدہ مریم کے بارے میں 'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا' کے الفاظ ہیں جو موازنے کے اصول پر ازواج نوح و لوط کے لیے بد چلنی ثابت کر دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلی دو باتیں اپنی ذات میں ہرگز قرائن نہیں ہیں، بلکہ اصل صورت حال کا بیان ہے کہ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں عورت و مرد کا ذکر ہوا ہے اور خیانت کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اس لحاظ سے دیکھا

۲۷۔ یہ ان کی عنایت ہے کہ انھوں نے یہ قرائن اپنی اس راے کے باوجود پیش کر دیے ہیں کہ خیانت کا لفظ جب ان کے بغیر آئے تو اس کا معنی بد چلنی ہوتا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جائے تو صرف تیسری بات اپنی ذات میں قرینہ قرار دی جاسکتی ہے، چنانچہ ہم اسی کے تناظر میں بتائیں گے کہ ان کا یہ ''قرینہ'' خیانت کے لفظ میں بد چلنی کا معنی کسی صورت بھی پیدا نہیں کرتا۔ بس چند باتیں سامنے رہیں:

'اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' کے الفاظ اس لیے بد چلنی کے لیے قرینہ نہیں ہیں کہ یہ خیانت کی طرح سیدہ مریم کے کسی فعل کو بیان کرنے کے لیے نہیں آئے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں عفت و عصمت کا بیان پایا جاتا ہے، مگر اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن کے محاورے میں یہ ان کے لیے ایک نام کی سی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اور یہاں اس کی دلیل ان پر آنے والا 'فَنَفَخۡنَا فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِنَا' کا جملہ ہے جو نتیجے کے طور پر آیا ہے اور اس نے ان کے اندر مریم بنت عمران کے تعارف کا پہلو غالب کر دیا ہے۔ اور اس کی دوسری واضح ترین دلیل یہ ہے کہ قرآن میں بعض مقامات پر اُن کا نام نہیں لیا گیا، بلکہ تعارف کے لیے محض 'وَالَّتِيۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' کے اِن الفاظ کو کافی سمجھا گیا ہے[28]۔

دوسرے یہ اس لیے بھی قرینہ نہیں ہو سکتے کہ آیت میں تنہا اسی وصف کو بیان نہیں کیا گیا کہ ہم اس کی روشنی میں خیانت کا معنی بد چلنی قرار دے لیں۔ یہاں ان کے دیگر اوصاف کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی کتابوں اور اس کے کلمات کی تصدیق کرنے والی اور نہایت فرماں بردار بندی تھیں۔ اب سیدہ مریم کے افعال ہی کی روشنی میں اگر خیانت کے معنی کی تعیین ہوتی ہے تو پوچھنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ 'اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' کا وصف تو خیانت میں بد چلنی کا معنی پیدا کر رہا ہے، مگر اُن کا وصف تصدیق اور فرماں برداری اس میں تکذیب اور نافرمانی کا معنی پیدا نہیں کر رہا؟ بلکہ یہ بھی پوچھنا چاہیے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہم ان مرکب افعال کی روشنی میں خیانت کے معنی کی تعیین کریں اور اس سے مراد غیر صالح اعمال پر مشتمل ان عورتوں کا کفر اور انکار سمجھیں؟

تیسرے یہ کہ یہاں صرف سیدہ مریم کے اوصاف حمیدہ بیان نہیں ہوئے، بلکہ فرعون کی بیوی اور اُس کے اعلیٰ کردار کا بیان بھی ہوا ہے۔ موازنے کے اصول پر یہاں خیانت کا معنی طے کرنے والوں کو اس بات کا بھی جواب دینا چاہیے کہ زوجۂ فرعون کا کردار اس تعیین میں مکمل طور پر کیوں پس پشت ڈال دیا گیا ہے؟ اور ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس کی روشنی میں خیانت کا معنی کفر کرنا اور اس پر مطمئن ہو جانا قرار دیا جاتا؟ بلکہ اس خاتون کا کردار تو یہاں اس لیے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کہ یہ 'اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا' سے پہلے اور خیانت کے استعمال کے متصل بعد مذکور ہوا ہے۔

۲۸۔ الانبیاء ۲۱: ۹۱۔

www.javedahmedghamidi.com www.al-mawrid.org

''قرینہ''کی حقیقت جان لینے کے بعد اب طالب علموں کو اس مقام پر بیان کیے گئے موازنے کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ یہاں دو عورتوں کے مقابلے میں دو عورتوں کے کردار کا بیان ہوا ہے۔ حضرات نوح اور لوط کی بیویوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اچھے ماحول کے باوجود کفر کا ارتکاب کر بیٹھیں اور انھیں خدا کے نیک بندوں کی تولیت میں رہنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔[29] مگر اس کے مقابلے میں فرعون کی بیوی ظلم پر مبنی نظام میں رہتے ہوئے بھی صرف اور صرف آخرت کی متلاشی رہی اور مریم اپنے زمانے کے حالات اور بنی اسرائیل کی اخلاقی گراوٹ کے باوجود اپنی عفت و عصمت کو بچائے رہیں اور ایمان و اسلام پر ہمیشہ قائم رہیں۔ گویا اصل موازنہ یہاں ان عورتوں کے کسی خاص فعل میں نہیں، بلکہ اس امر میں ہے کہ اچھے اور برے ماحول میں دو مختلف طبیعت عورتوں کے کردار میں کیا فرق واقع ہوا۔

حاصل بحث

اس ساری بحث کو چند نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ قرآن میں کسی نبی کے ازواج کے بارے میں بد چلنی کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔

۲۔ جن حضرات نے اس کے خلاف دعویٰ کر دیا ہے، انھوں نے بنا کسی قرینے کے محض خیانت کے لفظ سے اس کا معنی پیدا کرنا چاہا ہے۔

۳۔ ان پر لازم ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کے اِثبات میں قرآن کے کسی صریح مقام کی نشان دہی کریں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۹۔ یہاں 'تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ' کے الفاظ اس مقصد سے نہیں آئے کہ یہ عورتیں ان حضرات کی بیویاں ہیں جیسا کہ ان حضرات کو اس کا مغالطہ ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ ''نوح کی بیوی'' اور ''لوط کی بیوی'' جیسے صریح الفاظ بول دینے کے بعد اب اس طرح کے کسی قرینے کی بھلا کیا حاجت ہو سکتی ہے۔

محمد ذکوان ندوی

فوکس، احتساب

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اشراق ہند کے شمارہ (جون ۲۰۱۸ء) میں اداریے کے تحت ''موت کی یاد دہانی'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اِس مضمون میں موت کی یاد سے غفلت کی تذکیر کے ساتھ اخلاقیات کے معاملے میں لوگوں کی بے حسی پر نکیر بھی کی گئی تھی۔ اِس کو پڑھ کر ایک صاحب نے لکھا کہ ـــــ مضمون میں صرف موت اور معرفت جیسی چیزوں پر ''فوکس'' ہونا چاہیے۔ اِس میں غم خواری اور اخلاقیات جیسی چیزوں کو شامل کرنے سے قاری کا اصل فوکس (معرفت اور تذکیر بالموت) بدل گیا ہے۔

کسی ایک پہلو پر ''فوکس'' (focus) کرنا، بلاشبہ دعوتی اعتبار سے بعض مرتبہ ضروری ہوتا ہے، مگر یہ کوئی مطلق اصول نہیں۔ اکثر حالات میں مدعو کے احوال کی نسبت سے ضروری ہوتا ہے کہ ایک داعی تذکیر کے ساتھ تنبیہ و احتساب کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اُن چیزوں کو بھی اپنی دعوت و اصلاح کا موضوع بنائے جن کے معاملے میں لوگ غفلت کا شکار ہیں۔ اِس اعتبار سے دیکھیے تو یہ فوکس کا مسئلہ نہیں، بلکہ نکیر کا مسئلہ ہے، یعنی وہی چیز جس کو قرآن اور حدیث میں 'انکار منکر' کہا گیا ہے۔ اِس طرح کے معاملے میں ''فوکس'' کو بنیاد بنا کر رائے قائم کرنا بلا تشبیہ گویا اُسی طرح کی ایک بات ہو گی، جیسے ایک شخص یہ کہے کہ قرآن میں تبشیر کے ساتھ انذار کے شامل ہو جانے سے اُس کا فوکس بدل گیا ہے۔ قرآنی دعوت کو صرف تبشیر پر مبنی ہونا چاہیے۔

اگر یہ کہنا درست ہے تو پھر مذکورہ تصور دین کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موت جیسے موقع پر شریعت اور اخلاق کی تعلیم دینے کے بجاے صرف موت کی یاد دہانی کرانی چاہیے تھی، جب کہ واقعہ اِس کے

برعکس ہے۔اِس معاملے میں احادیث کے ذخیرے سے صرف 'کتاب الجنائز' کا مطالعہ مذکورہ تصور دین کی تردید کے لیے کافی ہو گا۔

اگردین کا مذکورہ تصور درست ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت جیسے موقع پر تذکیر بالموت کے علاوہ، لوگوں کو درج ذیل قسم کی ہدایات کیوں دیں:

☆ تعزیت کی تعلیم اور اُس کی تلقین کرتے ہوئے آپ کے ارشادات، جیسے: 'مَن عزّٰی مُصابًا، فله مثلُ أجره' (جس نے کسی مصیبت زدہ شخص کو صبر واحتساب کی تلقین کی تو اُس کے لیے بھی اُسی جیسا اجر ہو گا)[1]۔

☆ متوفی کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرنے کا حکم فرمانا[2]۔

☆ متوفی کی طرف سے اُس کے قرض کی ادائیگی کی تاکید کرتے ہوئے آپ کا یہ فرمانا: 'نفس المؤمن معلَّقة بدَينه، حتّٰی یُقضٰی عنه' (مسلمان کی جان اُس کے قرض کے ساتھ اٹکی رہتی ہے، جب تک کہ وہ میت کی طرف سے ادا نہ کر دیا جائے)[3]۔

☆ متوفی پر نوحہ وماتم کرنا[4]، بال ترشوانا[5]، پراگندہ بال ہونا[6]، منہ پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا[7]، قبر کو سجدہ گاہ بنانا[8] جیسے افعال کو ممنوع اور سرتاسر جاہلی افعال قرار دینا، وغیرہ۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اُس میں اِس قسم کے غیر فطری اپروچ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ انسان جسم اور روح، دونوں کا مجموعہ ہے، اِس لیے ضروری تھا کہ اُس میں جسم اور روح، دونوں سے متعلق رہنمائی موجود ہو۔ یہی وجہ

۱۔ ترمذی، رقم ۱۰۷۳۔

۲۔ ابوداؤد، رقم ۳۱۳۲۔

۳۔ ترمذی، رقم ۱۰۷۸۔ ابن ماجہ، رقم ۲۴۱۳۔

۴۔ مسلم، رقم ۹۳۴۔

۵۔ بخاری، رقم ۱۲۹۶۔ مسلم، رقم ۱۰۴۔

۶۔ ابوداؤد، رقم ۳۱۳۱۔

۷۔ بخاری، رقم ۱۲۹۷۔ مسلم، رقم ۱۰۴۔

۸۔ بخاری، رقم ۱۳۳۰۔ مسلم، رقم ۵۲۹۔

ہے کہ اسلام میں قانون وشریعت کی تعلیم بھی ہے اور فلسفہ وحکمت کی تلقین بھی۔ اسلام نہ صرف شریعت ہے اور نہ صرف حکمت، بلکہ وہ یکساں طور پر شریعت اور حکمت، دونوں کا جامع ہے۔ انسان کے ظاہر و باطن کے تزکیہ و تطہیر کے لیے جس خدا اور رسول نے حکمت کی تعلیم دی ہے، اُسی خدا اور رسول کی طرف سے اُس کو شریعت اور قانون بھی عطا کیا گیا ہے۔ اِس لیے ہم کو اِس بات سے ہمیشہ خدا کی پناہ مانگنا چاہیے کہ اِس معاملے میں ہم یہود و نصاریٰ کی طرح افراط و تفریط[9] کا شکار ہو کر خدا کے نزدیک 'گم راہ' اور 'مغضوب' قرار پائیں۔

(لکھنؤ، یکم جولائی ۲۰۱۸ء)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۹۔ قرآن کے مطابق، یہود نے ظواہر دین (شریعت) میں غلو کیا تھا، اور نصاریٰ نے روح دین میں غلو کر کے بہ زعم خود اِسی غلو آمیز تصور کو اصل دین قرار دے دیا۔

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت علی رضی اللہ عنہ

(۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ابراہیم کی وفات

۱۰ ربیع الاول ۱۰ھ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے ابراہیم کی اٹھارہ ماہ کی عمر میں وفات ہوئی۔ آپ نے حضرت علی کو عالیہ (قبا) میں اپنے ڈیرے، مشربۂ ام ابراہیم بھیجا۔ حضرت علی نے ابراہیم کی میت کو ایک ٹوکری میں ڈال کر گھوڑے کے آگے رکھا اور آپ کے پاس لے آئے۔ آپ میت کو غسل دلا کر، کفن پہنا کر، جنازہ لے کر نکلے۔ صحابہ آپ کے ساتھ تھے۔ محمد بن زید کے گھر سے ملحق کوچہ (دوسری روایت: جنت البقیع) میں ابراہیم کی تدفین ہوئی۔ حضرت علی قبر میں اترے، اسے ہموار کیا اور اس پر مٹی ڈالی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر میں ہاتھ رکھا اور فرمایا: آنکھ نم ناک ہے، دل مغموم ہے، لیکن ہم وہی بات کریں گے جو ہمارے رب کو ناپسند نہ ہو۔ ابراہیم ہم تمھاری وفات پر دل گرفتہ ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض وفات

ماہ صفر ۱۱ھ اختتام پذیر تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات اپنے آزاد کردہ حضرت ابو مویہبہ سے فرمایا: مجھے حکم ہوا ہے کہ اہل بقیع کے لیے دعاے مغفرت کروں۔ میرے ساتھ چلو۔ قبرستان پہنچ کر آپ یوں مخاطب ہوئے: السلام علیکم اے اہل قبور! مبارک ہو جس حال میں تم ہو۔ یہ اس سے بہتر ہے جس میں اب لوگ مبتلا ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا فتنہ برپا ہو رہا ہے جیسے سیاہ اندھیری رات کے پہر گزر رہے ہوں۔ آنے والا

فتنہ گزرے ہوئے سے بدتر ہوتا ہے۔ پھر آپ نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ابو مویہبہ! مجھے دنیاوی خزانوں اور جنت کی کنجیاں دی گئیں پھر اپنے رب اور اس کی جنت میں جانے کا اختیار دیا گیا۔ میں نے رب سے ملاقات کو ترجیح دی۔ آپ بقیع الغرقد سے لوٹے تو اس مرض کی ابتدا ہوئی جس سے آپ کی وفات ہوئی۔ آپ اس میں تیرہ دن (یا سات دن) مبتلا رہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: جب آپ واپس آئے، میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے ہائے میرا سر! کہا تو فرمایا: نہیں عائشہ! میرا سر بھی دکھ رہا ہے (بخاری، رقم ۵۶۶۶۔ ابن ماجہ، رقم ۱۴۶۵۔ مسند احمد، رقم ۲۵۹۰۸)۔ جمعرات ۲۸ صفر ۱۰ھ (۶۳۲ء) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام المومنین حضرت میمونہ کے ہاں تھے جب آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ درد کی شدت میں اضافہ ہو گیا تو آپ نے باقی ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہ کے کمرے میں آپ کی تیمارداری کی جائے (بخاری، رقم ۳۰۹۹)۔ دو آدمیوں کے سہارے چلتے ہوئے آپ اس حال میں تشریف لائے کہ پاؤں گھسٹ رہے تھے۔ ایک طرف سے حضرت عباس بن عبدالمطلب نے تھام رکھا تھا، حضرت عائشہ نے دوسرے شخص کا نام نہیں بتایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: وہ حضرت علی تھے (بخاری، رقم ۱۹۸)۔ دوسری روایت (بخاری، رقم ۶۸۶) میں ذکر ہوا، جب آپ کو غشی سے افاقہ ہوا تو دریافت فرمایا: کیا لوگوں نے نماز ادا کر لی؟ پھر آپ کے ارشاد کے مطابق حضرت ابوبکر کی امامت میں نماز ظہر شروع ہو گئی۔ اسی اثنا میں آپ کی طبیعت مزید بہتر ہوئی تو آپ دو آدمیوں کے سہارے سے حجرۂ عائشہ سے مسجد میں تشریف لائے اور حضرت ابوبکر کے پہلو میں نماز ادا فرمائی۔ اس روایت میں بھی راویہ سیدہ عائشہ نے تھامنے والے ایک صحابی حضرت عباس کا نام لیا اور دوسرے صاحب کا نام نہ لیا جو حضرت علی تھے (بخاری، رقم ۴۱۷۲)۔ کچھ مواقع پر حضرت فضل بن عباس اور حضرت اسامہ آپ کو سہارا دینے میں شامل ہوئے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مرض وفات میں حضرت علی آپ کی تیمارداری کر کے باہر آئے تو لوگوں نے پوچھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ انھوں نے کہا: تن درست ہو رہے ہیں۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور کہا: تین دن کے بعد تمھیں ڈنڈے کا یار سمجھ لیا جائے گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مرض سے جانبر نہ ہو سکیں گے، ابھی جا کر آپ سے خلافت کی بات کر لے۔ اگر ہمیں ملنے والی ہے تو معلوم ہو جائے اور اگر کسی اور کے بارے میں فیصلہ ہے تو آپ وصیت کر جائیں۔ حضرت علی نے کہا: اگر آج ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافت مانگ لی اور آپ نے منع کر دیا تو لوگ آیندہ بھی کبھی نہ دیں گے۔ بخدا! میں آپ سے یہ مطالبہ ہر گز نہ کروں گا۔ اسی دن چاشت کے وقت آپ کی وفات ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے پاس سات دینار رکھوائے ہوئے تھے۔ مرض وفات میں آپ کو یاد آیا تو حضرت عائشہ سے فرمایا: یہ علی کو بھجوا دو، اللہ کے نبی کے بارے میں کیا گمان کیا جائے گا اگر وہ یہ دینار لے کر اللہ سے جا ملے۔ اس کے بعد آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ حضرت عائشہ کو بیماری کی مصروفیت میں بھول گیا، لیکن یاد آنے پر انھوں نے یہ درہم حضرت علی کو بھجوا دیے اور انھوں نے صدقہ کر دیے (المنتظم ابن جوزی: ص ۹۱۵۔ مسند احمد، رقم ۲۴۷۳۳)۔

حضرت عائشہ سے پوچھا گیا، لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے حق میں وصیت کی؟ انھوں نے کہا: وفات کے وقت آپ کا سر میری گود میں تھا۔ آپ نے پیشاب کرنے کے لیے طشت منگوایا اور میری گود میں جھک کر لٹک گئے۔ مجھے آپ کی جان نکلنے کی خبر بھی نہ ہو سکی تو آپ نے کب علی کو وصی بنایا؟ (بخاری، رقم ۲۷۴۱۔ مسلم، رقم ۴۲۴۰۔ نسائی، رقم ۳۶۵۴۔ مسند احمد، رقم ۲۴۰۳۹)۔ ایسی روایات بھی پائی جاتی ہیں کہ آپ نے آخری وقت میں حضرت علی کو بلایا۔ انھوں نے آپ کو سینے سے لگایا ہی تھا کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

حضرت علی فرماتے ہیں: وفات سے کچھ دیر پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک ورق لانے کا حکم دیا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ اس میں دیر نہ لگ جائے۔ میں نے عرض کیا: آپ فرمائیں، میں یاد رکھوں گا۔ آپ نے نماز، زکوٰۃ اور غلاموں سے حسن سلوک کی وصیت فرمائی۔ ذہبی کہتے ہیں: یہ حدیث موضوع ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خلیفۂ اول کا انتخاب

صحابۂ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے صدمہ سے ذرا سنبھلے اور آپ کی تدفین کی فکر میں مصروف ہوئے تھے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اطلاع دی کہ انصار حضرت سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے بنو خزرج کی چوپال سقیفۂ بنو ساعدہ میں جمع ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکر نے حضرت علی، حضرت زبیر بن عوام اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ کو آپ کے پاس چھوڑا اور خود حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو لے کر سقیفہ پہنچے اور اعلان کیا کہ امیر قریش سے ہو گا اور انصار وزرا ہوں گے۔ اوس کے حضرت حباب بن منذر نے تجویز پیش کی، ایک امیر ہمارا ہو اور ایک تمھارا۔ حضرت عمر نے حضرت حباب کو یاد دلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو انصار کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی وصیت فرمائی تھی، یہ حکم انصار کو نہ دیا تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خلافت مہاجرین کے پاس رہے گی۔ دونوں میں تکرار ہونے لگی تو خزرج کے حضرت بشیر بن سعد کھڑے ہوئے اور کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریش سے تھے اور آپ نے یہ بھی فرمایا تھا

کہ 'الائمة من قریش'، "خلفا قریش سے چنے جائیں گے" (مسند احمد، رقم ۱۲۸۳۵۔ مستدرک حاکم۔ رقم ۶۹۶۲) اس لیے قریش ہی خلافت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ مجمع پر یک لخت سکوت طاری ہوا تو حضرت ابو بکر نے حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدہ کے نام تجویز کیے۔ ان دونوں نے اپنا ردعمل فوری ظاہر کیا، حضرت ابو بکر کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں نماز کا امام مقرر فرما دیا تھا اس لیے کوئی اور امارت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے حضرت عمر نے ان کی بیعت کی اور کہا: ہم ان قدموں کو کیسے پیچھے کر سکتے ہیں جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے کیا ہے۔ ان کے بعد حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور حضرت بشیر بن سعد بیعت کے لیے آگے بڑھے پھر چاروں طرف سے لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ خلافت کے دعویٰ دار حضرت سعد بن عبادہ انصار کے قبیلے خزرج کے سردار تھے۔ جب اسی قبیلے کے بشیر بن سعد نے ابو بکر کی بیعت کرنے میں سبقت کی تو اوس کے رئیس اسید بن خضیر نے اپنے قبیلے والوں سے کہا کہ وہ بھی پیچھے نہ رہیں۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور بنو ہاشم کے باقی مسلمانوں نے بیعت میں کچھ تاخیر کی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت علی اور بیعت

حضرت علی کی بیعت کے بارے میں متضاد روایتیں ہیں، حبیب بن ابو ثابت کہتے ہیں کہ وہ حضرت ابو بکر کی بیعت کے لیے اس قدر جلدی میں دوڑے آئے کہ تہ بند باندھا نہ چادر اوڑھی۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ حضرت عمر اور اکثر مہاجرین وانصار نے حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی تو انھوں نے آواز دی: کہاں ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد، زبیر اور آپ کے چچیرے اور داماد، علی؟ کیا آپ مسلمانوں کی جمعیت میں انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ دونوں اصحاب آئے اور کہا: ہمیں ملامت نہ کریں پھر حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی (مستدرک حاکم، رقم ۴۴۵۷۔ السنن الکبریٰ بیہقی، رقم ۱۶۵۳۸)۔ تیسری روایت کے مطابق حضرت علی نے گلہ کیا کہ سقیفۂ بنو ساعدہ کے اجتماع میں ان کو شریک نہیں کیا گیا تو حضرت ابو بکر نے جواب دیا کہ میں وہاں بیعت لینے کی غرض سے نہیں گیا تھا، بلکہ انصار و مہاجرین کا نزاع ختم کرانا مقصود تھا۔ اگر میں بیعت کو موخر کر دیتا تو مرنے مارنے کی نوبت آسکتی تھی۔ آپ تجہیز و تکفین کے انتظامات میں مصروف تھے، آپ کو کیسے بلا لیتا۔ تب حضرت علی کی شکایت رفع ہو گئی اور انھوں نے دوسرے ہی روز مسجد نبوی میں مجمع عام کے روبرو خلیفۂ اول کی بیعت کر لی۔ حضرت علی نے صراحت کی کہ وہ ابو بکر کو خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غار کے ساتھی تھے اور آپ نے اپنی زندگی ہی میں انھیں نماز کا امام مقرر فرما دیا تھا۔ اس لیے ان کی بیعت

میں جبر و اکراہ یا تقیہ کا دخل بتانا ان کے کمال ایمان اور شان اخلاص کے خلاف ہے اگرچہ ایسی روایت تاریخ میں در آئی ہے۔ زیاد بن کلیب کا کہنا ہے کہ حضرت عمر تلوار لے کر حضرت علی کے گھر پہنچے جہاں حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور کچھ مہاجرین تھے۔ انھوں نے آواز دی: بیعت کے لیے نکلو یا میں گھر جلا دوں؟ حضرت زبیر تلوار لے کر نکلے، مگر تلوار ان کے ہاتھوں سے گر گئی۔ حضرت زبیر نے حضرت علی کی بیعت لینے پر اصرار کیا، لیکن حضرت عمر نے ان پر قابو پا لیا اور پھر سب نے حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی۔ زہری کا اصرار ہے کہ اجتماع سقیفہ کے وقت حضرت علی بیت فاطمہ میں بیٹھے رہے، انھوں نے، نہ بنو ہاشم میں سے کسی نے حضرت ابوبکر کی بیعت کی۔ چھ ماہ بعد جب سیدہ فاطمہ کی وفات ہوئی تو لوگوں کی بے رخی محسوس کرتے ہوئے حضرت علی بیعت پر مائل ہوئے۔

جسد پاک کی تدفین

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قضیۂ خلافت طے ہونے کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین عمل میں آئی۔ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت عباس کے بیٹوں حضرت فضل و حضرت قثم اور آپ کے آزاد کردہ حضرت اسامہ اور حضرت شقران (اصل نام: حضرت صالح) نے مل کر بیری اور پانی سے جسد مبارک کو غسل دیا۔ حضرت علی نے آپ کو اپنے سینے سے لگا کر بٹھایا، حضرت عباس، حضرت فضل اور حضرت قثم کروٹ بدلنے میں شریک رہے، حضرت اسامہ اور حضرت شقران نے پانی ڈالا۔ آپ کی قمیص جسم پر رہی، حضرت علی پانی جسم پر ملتے اور کہتے جاتے: میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ زندگی میں اور وفات کے بعد بھی کیا پاک و طیب ہیں! فرماتے ہیں: آپ کے جسم پر کوئی نشان نہ تھا۔ جو پانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پپوٹوں پر جمع ہوا حضرت علی نے اسے چوس لیا۔ بنو عوف بن خزرج کے حضرت اوس بن خولی نے حضرت علی سے درخواست کی کہ ہمیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ ان کی اجازت سے وہ بھی حجرۂ مبارکہ میں آ کر بیٹھ گئے۔

حضرت علی، حضرت فضل اور حضرت قثم قبر میں اترے اور جسد پاک کو اس میں اتارا۔ حضرت اوس بن خولی بھی حضرت علی کی اجازت سے لحد میں اترے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں: میں نے اپنی انگوٹھی جان بوجھ کر قبر مبارک میں پھینک دی پھر اسے نکالنے کے لیے اس میں اترا تاکہ آپ کے پاس رہنے والا سب سے آخری آدمی بن جاؤں۔ حضرت علی کہتے ہیں، ان کی بات غلط ہے، سب سے آخر میں حضرت قثم بن عباس آپ کے پاس سے آئے۔

حضرت علی نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارکہ یوں بیان کیا ہے، آپ زیادہ لمبے تھے نہ چھوٹے قد کے۔ آپ کا سر بڑا، بال سیدھے اور گھنے تھے، کانوں تک آتے۔ ڈاڑھی بھری تھی، سینے کے بال لمبے تھے۔ ہتھیلیاں اور پاؤں موٹے تھے، کندھے چوڑے تھے، آنکھیں بڑی، سیاہ اور لمبی پلکوں والی تھیں، چہرہ سرخی مائل سفید اور کم گوشت والا تھا، گردن صراحی دار تھی۔ چہرے پر پسینہ آتا تو موتیوں کی طرح چمکتا۔ جب آپ چلتے تو اس طرح قدم اٹھاتے گویا نشیب میں اتر رہے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا خچر دلدل حضرت علی کے پاس آگیا۔ اپنے دور خلافت میں وہ اس پر سوار ہوتے رہے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد وہ حضرت عبداللہ بن جعفر کو مل گیا۔

عہد صدیقی

حضرت ابوبکر کے خلیفہ بننے کے بعد حضرت خالد بن سعید حضرت علی سے ملے اور کہا: اے ابوالحسن (علی)! اے بنی عبد مناف! کیا تم خلافت میں مغلوب ہو گئے ہو؟ حضرت علی نے کہا: تم اسے مغلوب ہونا کہتے ہو یا انتخاب خلافت سمجھتے ہو؟ حضرت خالد نے کہا: جو لوگ تم پر غالب آئے ہیں تم سے زیادہ خلافت کے حق دار نہ تھے۔ حضرت عمر پاس تھے، انھوں نے حضرت خالد بن سعید کو ڈانٹا اور حضرت ابوبکر کو اس گفتگو کی خبر دی، لیکن انھوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ جب بنو ہاشم کے تمام افراد نے بیعت کر لی تو حضرت خالد بن سعید نے بھی دست بیعت بڑھا دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیدنا ابوبکر کی بیعت ہو چکی تو حضرت ابوسفیان نے کہا: میں ایسا غبار اٹھتے دیکھ رہا ہوں جسے ایک خون ریزی ہی رفع کر پائے گی۔ عبد مناف کی اولاد! ابوبکر کا تمھارے معاملات سے کیا تعلق؟ کم زور اور پست علی و عباس کہاں ہیں؟ اقتدار قریش کی ایک چھوٹی سی شاخ میں کیوں؟ پھر علی کو دعوت دی، ہاتھ پھیلاؤ، میں تمھاری بیعت کر لیتا ہوں۔ بخدا! میں پیادوں اور گھڑ سواروں سے مدینہ بھر دوں گا۔ حضرت علی نے ڈانٹ کر کہا: ایسا کر کے آپ فتنہ پھیلانا چاہتے ہیں، ابھی تک اسلام کے لیے برا ہی سوچتے ہیں؟ آپ کی خیر خواہی کی ضرورت نہیں۔

حیات نبوی میں اموال خمس کی تقسیم کی ذمہ داری حضرت علی پر تھی۔ حضرت ابوبکر نے ان کا منصب برقرار رکھا۔ دینی و انتظامی امور میں بھی وہ خلیفۂ اول کے مشیر (رکن مجلس شوریٰ) رہے۔

فتنۂ ارتداد

خلافت صدیقی کے آغاز میں ارتداد کا طوفان اٹھا۔ بنو اسد، بنو غطفان، بنو طے، بنو لیث اور بنو مدلج کے قبائل

نے ایک وفد مدینہ بھیجا جس نے زکوٰۃ نہ دینے کا اعلان کیا۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا: جب تک حالات پر سکون نہیں ہوتے اور مدینہ کے گرد و نواح سے فوجیں چھٹ نہیں جاتیں زکوٰۃ لینے پر اصرار نہ کیا جائے۔ حضرت ابو بکر نے اس موقع پر ایک پر جوش خطبہ دیا کہ اگر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دی جانے والی اونٹ کے زانو باندھنے والی ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تو میں قبول نہ کروں گا۔ مرتدین کے وفد نے واپس جا کر پڑوسی قبائل کو خبر دی کہ اس وقت مدینہ میں بہت کم آدمی ہیں، حملہ کرنے کا اچھا موقع ہے۔ حضرت ابو بکر کو بھی احساس تھا کہ جیش اسامہ روانہ کرنے کے بعد شہر کی حفاظت کے لیے بہت کم نفری موجود رہ گئی ہے۔ انھوں نے مدینہ آنے والے راستوں پر پہرہ دار دستے مقرر کر دیے۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عبداللہ بن مسعود ان دستوں کے سردار مقرر ہوئے۔ قابل غور بات ہے کہ اگر حضرت علی نے بیعت نہ کی ہوتی تو وہ ان دستوں میں شامل کیسے ہوتے؟ حضرت ابو بکر نے اہل مدینہ کو مسجد نبوی کے آس پاس رہنے کی تلقین کی۔ تین ہی دن کے بعد عبس، ذبیان، اسد اور کنانہ کے قبائل نے مدینہ پر چڑھائی کر دی تو انھی دستوں نے انھیں شہر میں گھسنے سے روکا۔ پھر حضرت ابو بکر خود کمک لے کر آئے اور حملہ آوروں کو مار بھگایا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت اسامہ کو روانہ کرنے کے بعد حضرت ابو بکر باغی بدوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے خود لشکر لے کر ذوالقصہ پہنچے جو مدینہ سے دن بھر کے سفر پر واقع ہے۔ حضرت علی نے ان کی اونٹنی کی مہار تھامی اور کہا: خلیفۂ رسول اللہ! کہاں جا رہے ہیں؟ میں آپ سے وہی بات کہتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے دن فرمائی تھی: اپنی تلوار سنبھال لیں اور ہمیں اپنی جان کا صدمہ نہ دکھائیں۔ مدینہ واپس چلے جائیں اور بدوؤں سے لڑنے کے لیے اپنے لڑاکا جاں بازوں کو بھیج دیں۔ واللہ! اگر ہمیں آپ کا رنج دیکھنا پڑا تو اسلام کا نظام کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر مدینہ لوٹ آئے۔

جنگ یمامہ کے اسیروں میں سے بنو حنفیہ کی خولہ بنت جعفر حضرت علی کے حصہ میں آئیں۔ انھی سے محمد بن حنفیہ نے جنم لیا۔

جنگ ثنی اور جنگ زمیل: مرتدوں کے ایک سردار ربیعہ بن بجیر نے مصیخ اور حصید میں اپنی فوجیں جمع کر رکھی تھیں، حضرت خالد بن ولید نے اس پر حملہ کیا۔ ربیعہ بن بجیر کی بیٹی صہبا ان کی قید میں آئی تو انھوں نے حضرت ابو بکر کو بھیج دی، حضرت علی نے اسے خرید لیا، اسی سے عمر اور رقیہ پیدا ہوئے۔

حضرت فاطمہ کی وفات

حضرت فاطمہ اور حضرت عباس میراث نبوی میں سے فدک اور خیبر کا حصہ مانگنے حضرت ابو بکر کے پاس گئے (بخاری، رقم ۶۷۲۵۔ مسلم، رقم ۴۶۰۲)۔ تو انھوں نے فرمایا: آل محمد کے لیے اللہ کے مال میں سے کھانے پینے کے خرچ سے زیادہ لینا جائز نہیں (مسلم، رقم ۴۶۰۴۔ نسائی، رقم ۴۱۴۶۔ مسند احمد، رقم ۵۸)۔ واللہ! میں عہد نبوت میں ان کو دیے جانے والے وظائف میں ہر گز تبدیلی نہ کروں گا اور وہی طریقہ جاری رکھوں گا جس پر آپ نے عمل فرمایا (بخاری، رقم ۳۷۱۲۔ مسلم، رقم ۴۶۰۳۔ ابو داؤد، رقم ۲۹۶۸۔ مسند احمد، رقم ۵۵)۔ ان کا مطلب تھا کہ خیبر و فدک کی آمدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرکاری اخراجات اور امور مملکت کے لیے پیش آنے والے اتفاقی مصارف کے لیے خاص تھی۔ حضرت فاطمہ اس بات پر ناراض ہو گئیں اور ان سے بول چال ترک کر دی، البتہ جب وہ علیل ہوئیں تو حضرت ابو بکر ان کی عیادت کو گئے اور انھیں راضی کیا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ جب حضرت علی خود خلیفہ بنے تو انھوں نے بھی فدک میں سے حضرت فاطمہ اور حضرت عباس کی اولادوں اور ازواج النبی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا۔

حضرت فاطمہ کے مرض میں حضرت ابو بکر کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس ان کی مسلسل تیمار داری کرتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد ۳ر مضان ۱۱ھ کو حضرت فاطمہ کا انتقال ہوا تو حضرت اسماء نے ان کی وصیت کے مطابق ان کی اسی طرح نعش بنائی جیسے حبشہ میں دیکھی تھی۔ انھوں نے کھجور کی چند تر ٹہنیوں کے پتے کاٹ کر چارپائی پر اس طور سے رکھ دیں کہ درمیان سے ابھری ہوئی تھیں پھر ان پر کپڑا ڈال دیا۔ پھر ان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے حضرت علی اور حضرت ابو رافع کی بیوی حضرت ام سلمٰی کے ساتھ مل کر ان کو غسل دیا (مستدرک حاکم، رقم ۴۷۶۹)۔ حضرت علی نے البتہ حضرت ابو بکر کو اطلاع دیے بغیر راتوں رات ان کی تدفین کر دی (بخاری، رقم ۴۲۴۰۔ مسلم، رقم ۴۶۰۱۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۷۶۴)۔ حضرت عباس بن عبد المطلب نے جنازہ پڑھایا اور حضرت علی، حضرت عباس اور حضرت فضل بن عباس نے میت قبر میں اتاری۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت زبیر اور عبد الرحمٰن بن عوف حاضر ہوئے اور حضرت ابو بکر نے جنازہ پڑھایا۔

حضرت فاطمہ کی وفات کے بعد حضرت علی کو حضرت ابو بکر سے صلح اور تجدید بیعت کا خیال آیا۔ انھوں نے حضرت ابو بکر کو گھر بلایا اور انتخاب خلافت میں شامل نہ کرنے اور میراث نبوی سے محروم کرنے کا شکوہ

کیا۔ حضرت ابو بکر رونے لگ گئے اور کہا: میں نے جو کچھ کیا، اسوۂ رسول پر عمل کرتے ہوئے کیا۔ ظہر کی نماز پڑھانے کے بعد حضرت ابو بکر منبر پر چڑھے اور حضرت علی کی شان و فضیلت بیان کی۔ حضرت علی آگے بڑھے اور ان کی بیعت کی۔ ابن کثیر کہتے ہیں: یہ بیعت ثانیہ میراث کے مسئلہ پر حضرت ابو بکر اور حضرت فاطمہ میں ہونے والی شکر رنجی دور کرنے کے لیے کی گئی۔ گذشتہ چھ ماہ میں حضرت علی حضرت ابو بکر کی اقتدا میں نماز پڑھتے رہے اور ان کے مشوروں اور ان کی مہمات میں شامل ہوتے رہے تھے۔ مزید برآں حضرت فاطمہ نے حضرت ابو بکر کو جائز خلیفہ اور امیر المومنین مانتے ہوئے فدک کا مقدمہ ان کے سامنے پیش کیا تھا۔

حضرت امامہ بنت ابو العاص سے نکاح

۱۲ھ میں حضرت علی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی حضرت امامہ سے شادی کی۔ وہ آپ کی سب سے بڑی بیٹی حضرت زینب کی صاحب زادی تھیں۔ سیدہ خدیجہ کے بھانجے حضرت ابو العاص ان کے والد تھے جو ۷ھ میں مسلمان ہوئے۔ ابن کثیر کہتے ہیں: ہم نہیں جانتے تب وہ زندہ تھے یا وفات پا چکے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

عمل قوم لوط کی حد

حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابو بکر کو خط لکھا کہ انھوں نے ایک عرب کو دوسرے مرد سے اسی طرح نکاح کرتے دیکھا ہے جس طرح عورت سے کیا جاتا ہے۔ حضرت ابو بکر نے حضرت علی سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا: دنیا میں ایک ہی گروہ، حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے یہ فعل کیا تو اللہ نے ان پر پتھروں کی بارش برسا دی۔ میرے خیال میں اس شخص کو قتل کر کے اس کی لاش جلا دینی چاہیے۔ دیگر صحابہ بھی اس رائے سے متفق ہو گئے تو حضرت ابو بکر نے یہ حد جاری کر دی۔

حضرت ابو بکر کا حضرت عمر کو خلیفہ مقرر کرنا

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: حضرت علی اور حضرت طلحہ حضرت ابو بکر کے آخری وقت ان کے پاس آئے اور پوچھا: آپ نے کسے جانشین مقرر کیا ہے؟ انھوں نے بتایا: عمر کو، تو وہ بولے: اپنے رب کو کیا جواب دیں گے؟ حضرت ابو بکر نے کہا: تم مجھے اللہ سے ڈراتے ہو؟ میں کہوں گا: میں نے مسلمانوں پر ان کے بہترین شخص کو خلیفہ نامزد کیا (طبقات ابن سعد: ذکر استخلاف عمر)۔ دوسری روایات اس کے برعکس ہیں۔ حضرت ابو بکر نے مرض الموت میں گھر کے روشن دان سے لوگوں سے سوال کیا: میں نے اپنے جانشین کے بارے میں وصیت کی ہے۔ کیا تم اس پر رضامند ہو؟ حاضرین نے اعلان کیا: ہم راضی ہیں۔ حضرت علی اٹھے اور فرمایا: ہم یہی پسند

کرتے ہیں کہ عمر اگلے خلیفہ بنیں (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۶۸۳)۔ کچھ لوگ حضرت ابو بکر و حضرت عمر کی برائی کر رہے تھے۔ حضرت علی کو پتا چلا تو حضرت ابو بکر کی مدح کرنے کے بعد فرمایا: ان کے بعد عمر بن خطاب والیِ خلافت ہوئے۔ کچھ لوگ ان سے راضی تھے اور کچھ ناپسند کرتے تھے۔ میں انھیں پسند کرنے والوں میں سے تھا (کنز العمال: ۳۶۱۴۰)۔

عہد فاروقی

۱۳ھ میں جس روز حضرت عمر فاروق خلیفہ منتخب ہوئے اسی دن حضرت علی کو منصب قضا کی ذمہ داری سونپ دی۔ وہ مجلس شوریٰ میں بھی شامل تھے۔ دوسرے ممبر حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت سعد تھے۔ حضرت عمر نے حضرت علی کے کہنے پر ایک زانیہ پر حد جاری نہ کی کیونکہ وہ پاگل تھی۔ حضرت عمر کو اس بات کا علم نہ تھا۔ حضرت علی نے ایک حاملہ پر بھی حد جاری کرنے سے روکا۔ تب حضرت عمر نے کہا: عورتیں علی جیسے کو جنم دینے سے عاجز آ گئی ہیں۔ اگر علی نہ ہوتا تو عمر ہلاک، برباد ہو جاتا۔ ایک عورت نے مرد کے کپڑوں پر انڈے کی سفیدی چھینک کر دست درازی کا الزام لگا دیا۔ حضرت عمر نے حضرت علی سے مشورہ طلب کیا۔ انھوں نے مرد کے کپڑوں پر ابلتا پانی ڈالا تو انڈے کی سفیدی نمایاں طور پر نظر آنے لگی۔ حضرت عمر نے حضرت علی کے مشورے پر شراب خور پر اسی درے کی تعزیر جاری کی۔ ان کا کہنا تھا: نشے میں آ کر شرابی بک بک کرتا ہے اور جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ اس لیے اسے اسی درے مارے جائیں۔

حضرت علی نے ایک بار حضرت عمر سے پوچھا: آپ نے خالد کو معزول کیوں کیا تھا؟ عمر نے جواب دیا، انھوں نے بڑے بڑے لوگوں اور شعرا پر مال صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت علی نے کہا: آپ انھیں مالی معاملات سے الگ کر دیتے اور فوج کی سربراہی پر رہنے دیتے۔ حضرت عمر نے کہا: وہ اس پر راضی نہ ہوتے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی سے کہا: مجھے خالد کی معزولی پر ندامت ہے۔

حضرت علی نے حضرت عمر کو مدینہ کے نواح میں بھاگتے ہوئے دیکھا تو پوچھا: امیر المومنین! کہاں جا رہے ہیں؟ بتایا: صدقے کا ایک اونٹ بدک گیا ہے، اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ نے تو اپنے بعد آنے والے خلفا کو مشقت میں ڈال دیا ہے۔ حضرت علی نے کہا۔

ایک بار حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی بیت المال کے اونٹوں کے باڑے میں گئے۔ حضرت عثمان لکھنے کے لیے سائے میں بیٹھ گئے، حضرت علی ان کے سر پر کھڑے ہو کر لکھوانے لگے۔ حضرت عمر سخت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

گرمی میں دو سیاہ چادریں اوڑھے دھوپ میں کھڑے تھے۔ وہ صدقات کے اونٹوں کی تعداد، ان کے رنگ اور دانتوں کی تعداد بولتے اور حضرت علی لکھواتے جاتے۔ اس موقع پر حضرت علی نے حضرت عثمان سے کہا: کتاب اللہ میں حضرت شعیب کی بیٹی کا بیان ہے: 'یا ابت استاجره ان خیر من استاجرت القوی الامین'، ''اباجان! اس شخص کو اجرت پر رکھ لیجیے، یقیناً بہترین انسان جسے آپ ملازم رکھ سکتے ہیں قوی اور امین ہی ہو سکتا ہے''۔ پھر حضرت عمر کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہی قوی و امین ہیں۔ ایک اور موقع پر حضرت علی نے فرمایا: میں نے عمر کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا، ان کے تہ بند پر اکیس پیوند لگے ہوئے تھے، ایک چمڑے سے لگایا گیا تھا۔

جہاد عراق

۱۴ھ کی ابتدا میں حضرت عمر فوج لے کر مدینہ سے نکلے اور صرار کے قدیم کنویں پر پہنچ کر اسے ترتیب دیا۔ حضرت عثمان نے منزل کا پوچھا تو بتایا کہ وہ عراق جانا چاہتے ہیں۔ حاضرین نے کہا: آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔ حضرت عمر نے کہا: میرا جانا اصحاب رائے سے مشورے پر موقوف ہے۔ چنانچہ حضرت علی کو جنھیں وہ مدینہ پر نائب امیر مقرر کر آئے تھے، مشورہ کرنے کے لیے طلب کیا، حضرت عمر نے مقدمۂ فوج سے حضرت طلحہ کو اور میمنہ و میسرہ سے حضرت زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو بھی بلایا۔ شوریٰ کی اکثریت نے حضرت عمر کو سفر جہاد جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا: اگر فوج نے شکست کھائی تو وہ آپ کی ہزیمت کی مانند نہ ہو گی اور اگر آغاز کار ہی میں آپ نے شہادت پائی تو اہل ایمان تکبیر پڑھ سکیں گے نہ 'لا الٰہ' کی شہادت دے سکیں گے۔ ان کی رائے تھی: کسی دوسرے جرنیل کو کمان سونپ کر مدینہ لوٹ جائیں۔ انھوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کا نام بھی تجویز کیا۔ مدینہ واپسی سے پہلے حضرت عمر نے فوج کا معاینہ کیا، کچھ نوجوانوں کے پاس سے گزرے تو منہ پھیر لیا اور کہا: عربوں میں مجھے ان لڑکوں سے زیادہ برا کوئی نہیں لگا۔ حیرت کی بات ہے، اس گروپ میں ایک سودان بن حمران تھا جس نے سیدنا عثمان کی شہادت میں حصہ لیا، دوسرا ابن ملجم تھا جس نے سیدنا علی کو شہید کیا، تیسرا معاویہ بن حدیج تھا جس نے قصاص عثمان کے بہانے مسلمانوں میں تلوار سونتی اور چوتھا حصین بن نمیر تھا جو حضرت علی سے جنگ کرنے میں پیش پیش تھا۔

حضرت عمر کا سفر شام و فلسطین

جنگ اجنادین میں شکست کھانے والے رومی جرنیل ارطبون (اطربون، Tribunus) نے حضرت عمرو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بن عاص کو خط لکھا کہ اجنادین کے بعد اب آپ فلسطین کا کوئی شہر فتح نہیں کر سکتے۔ہاں کوئی سہ حرفی نام رکھنے والا ہی اسے زیر کر سکتا ہے۔ حضرت عمرو نے سمجھ لیا کہ یہ حضرت عمر ہی ہوں گے۔انھوں نے حضرت عمر کو بلا بھیجا۔ حضرت عمر شام کے سفر پر نکلے تو حضرت علی نے کہا: آپ خود کہاں جا رہے ہیں ؟ کسی جھگڑالو دشمن کا سامنا کرنا چاہتے ہیں ؟ حضرت عمر نے کہا: میں عباس کی وفات سے پہلے جہاد کی طرف سبقت کرنا چاہتا ہوں۔عباس نہ رہے تو تمھاری معرکہ آرائیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔یہ امر واقعی ہے کہ حضرت عباس عہد عثمانی کے چھٹے سال فوت ہوئے اور تبھی فتوحات کا سلسلہ رک گیا(طبری ۲/۴۴۹۔ المنتظم ابن جوزی ۱۰۳/۷)۔ سفر شام کا دوسرا سبب بیت المقدس کا محاصرہ بنا۔شوال ۱۵ھ (نومبر ۶۳۶ء) میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا تو شہر والے اس شرط پر شہر چھوڑنے پر آمادہ ہوئے کہ امیر المومنین خود آکر معاہدۂ صلح کریں۔ حضرت عمر نے اصحاب شوریٰ سے مشورہ کیا۔ حضرت عثمان نے کہا: مت جائیں تاکہ اہل کفر کی تحقیر و ذلت ہو۔ حضرت علی نے سفر کرنے کا مشورہ دیا تاکہ مسلمانوں کے لیے بیت المقدس کا محاصرہ جاری رکھنا سہل ہو جائے۔ حضرت عمر نے حضرت علی کا مشورہ قبول کیا اور انھیں مدینہ کا قائم مقام امیر مقرر کر کے مع لشکر (اپریل ۶۳۷ء میں) شام روانہ ہو گئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایک موقع پر حضرت عمر نے حضرت علی کو سپہ سالار بنا کر شام بھیجنا چاہا، لیکن حضرت علی آمادہ نہ ہوئے۔

دیوان وظائف

اسی سال حضرت عمر بن خطاب نے وظیفوں کا رجسٹر (دیوان) بنانا چاہا تو حضرت علی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے مشورہ دیا، دیوان اپنے نام سے شروع کریں۔ حضرت عمر نے کہا: میں اس کی ابتدا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس سے کروں گا پھر آپ سے قرابت کی بنیاد پر آپ کے اعزہ کو ترتیب دوں گا۔اسی موقع پر انھوں نے عامۃ المسلمین سے دریافت کیا، مجھے اللہ نے تجارت کے ذریعے سے مال دار کر رکھا تھا،اب تم نے مجھے امور خلافت میں مصروف کر دیا ہے۔ تمھاری کیا راے ہے، میرے لیے بیت المال سے کچھ لینا جائز ہے؟ حضرت علی بھی موجود تھے تاہم خاموش رہے۔ سب لوگوں نے وظیفہ لینے کا مشورہ دیا، لیکن حضرت عمر نے حضرت علی سے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟انھوں نے جواب دیا: اس قدر ہی لے سکتے ہیں جتنا آپ کے لیے اور آپ کے کنبے کے لیے عام رہن سہن کے مطابق خرچ کرنا ضروری ہو۔ سب لوگوں نے حضرت علی کی بات کی پر زور تائید کی۔ چنانچہ وہ حضرت ابو بکر کا مقررہ وظیفہ لیتے رہے۔بعد میں ان کی ضرورتیں بڑھ گئیں تو حضرت

عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے آپس میں مشورہ کیا کہ امیر المومنین کا وظیفہ بڑھانا چاہیے۔ انھوں نے ان کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ سے کہا کہ ہمارا نام لیے بغیر یہ بات ان سے کریں۔ حضرت عمر غصے میں آ گئے اور کہا: مجھے یہ مشورہ دینے والوں کا نام بتاتی تو میں ان سے بری طرح پیش آتا۔ میں اسی خوراک اور لباس کے ساتھ گزارا کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ تھا۔

مال غنیمت کی تقسیم اور آمدن کا حساب

قادسیہ و دمشق کی فتوحات اور عراق کے دیہات (سواد) سے صلح کے معاہدے ہو جانے کے بعد حضرت عمر نے مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا۔ حضرت عمر اور حضرت علی کا اس پر اتفاق تھا کہ چار حصے اہل سپاہ میں تقسیم کیے جائیں اور پانچواں حصہ (خمس) اللہ و رسول کے واسطے سے غربا و یتامیٰ، مہاجرین اور رشتہ داروں میں بانٹ دیا جائے۔ اس کے برعکس جزیہ کلی طور پر ان لوگوں پر صرف کیا جاتا ہے جو ذمیوں کی حفاظت کریں۔ اس میں سے خمس نہیں نکالا جاتا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عمر نے بنو تغلب کے عیسائیوں سے لیے جانے والے ٹیکس کو جزیہ کے بجاے صدقہ کا نام حضرت علی کے مشورہ سے دیا۔

حضرت عمر نے بیت المال میں آنے والے مال و دولت کا حساب رکھنے کے لیے رجسٹر بنانے کا مشورہ لیا تو حضرت علی نے کہا: آپ ہر سال جمع ہونے والے مال کو بانٹ دیا کریں اور کچھ باقی نہ رکھیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا: میرے خیال میں بہت مال اکٹھا ہوا کرے گا جو سب مسلمانوں کے لیے کافی ہو گا۔ اگر حساب نہ رکھا جائے گا تو پتا نہیں چل سکے گا کہ کس کو ملا اور کسے نہیں ملا۔ حضرت ولید بن مغیرہ نے مشورہ دیا: امیر المومنین! میں شام گیا تو دیکھا کہ وہاں کے بادشاہ دیوان مرتب کرتے ہیں اور فوجوں کا حساب رکھتے ہیں۔ حضرت عمر نے ان کا مشورہ قبول کیا۔

حضرت عمر نے حضرت علی کو ینبع کے مقام پر قطعۂ اراضی عطا کیا۔ یہ زمین زرخیز تھی، ایک قدرتی چشمے سے سیراب ہونے کی وجہ سے اس سے معقول آمدن حاصل ہوتی تھی (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۳۰۰۷)۔

فتح مدائن

صفر ۱۶ھ (مارچ ۶۳۷ء): مدائن (Ctesiphon) فتح کرنے کے بعد جیش اسلامی کے کمانڈر حضرت سعد بن ابی وقاص نے جنگ میں حاصل ہونے والا مال غنیمت اور خمس مدینہ ارسال کیے۔ کسریٰ (خسرو) کی تلوار،

اس کا قیمتی غلاف اور آرایشی سونا امیر المومنین حضرت عمر کو پیش کیے گئے تو فرمایا: جس قوم نے یہ سب بے کم و کاست پہنچا دیا ہے، یقیناً امانت دار ہے۔ حضرت علی نے جواب دیا: آپ نے اپنا دامن پاک رکھا ہے اس لیے آپ کی رعیت بھی پاک باز ہے۔ اگر آپ عیش و عشرت میں پڑ جاتے تو عوام بھی حرص و آز میں پڑ جاتے۔ حضرت سعد نے خمس میں ایک بیش قیمت ریشمی قالین 'بہار خسروی' بھی بھیجا جس پر سونے، موتیوں اور جواہرات سے ایران کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ ساٹھ مربع گز کے اس قالین کو شاہان خسروی سردیوں میں بادہ خواری کے لیے استعمال کرتے۔ اس پر نشست سجاتے تو لگتا کہ کسی باغ میں بیٹھے ہیں۔ حضرت سعد کو سمجھ نہ آیا کہ قالین کو کیوں کر تقسیم کریں، آخر کار سپاہیوں سے درخواست کی کہ اپنا تین چوتھائی حصہ چھوڑ دیں اور دوسری نادر غنیمتوں کی طرح قالین کو سالم ہی مدینہ بھیج دیا۔ حضرت عمر نے غنائم بانٹے، قالین دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے۔ صحابہ سے مشورہ کیا۔ کسی نے کہا کہ اس کو اپنے پاس رکھ لیں، کسی نے دے ڈالنے کی رائے دی۔ حضرت علی کی بے ثبات دنیا سے بے نیازی دیکھیے، مشورہ دیا: اس دنیا میں وہی کچھ آپ کا ہے جو آپ نے کسی کو دے دیا، پہن کر استعمال کر لیا یا کھا کر ختم کر دیا۔ اگر آپ نے قالین کو اسی شکل میں برقرار رکھا تو کل کلاں کوئی شخص استحقاق کے بغیر ہی اس کا مالک بن بیٹھے گا۔ حضرت عمر کا تفقہ ملاحظہ ہو: اس تجویز کو تسلیم کیا اور فی الفور اس قالین کے پرزے پرزے کر کے لوگوں میں بانٹ دیے۔ قالین کی قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علی کے حصے میں آیا ہوا معمولی ٹکڑا بیس ہزار دینار میں بکا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسلامی کیلنڈر کی ابتدا

اپنی خلافت کے اڑھائی سال بعد ۱۶ھ میں حضرت عمر نے حضرت علی کے مشورے سے تاریخ لکھنا شروع کی۔ انھوں نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ لیا، ہم اپنے مہ و سال کا حساب (یعنی کیلنڈر کی ابتدا) کس دن سے کریں؟ حضرت علی نے جواب دیا، اس روز سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور شرک کی سرزمین کو چھوڑا۔

ام کلثوم بنت علی کا نکاح

۱۷ھ میں حضرت عمر نے حضرت علی اور سیدہ فاطمہ کی بیٹی حضرت ام کلثوم سے شادی کی۔ قبل ازیں وہ ام کلثوم بنت ابو بکر کو نکاح کا پیغام بھیج چکے تھے۔ انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ عمر کٹھن زندگی گزارتے ہیں اور عورتوں پر سختی کرتے ہیں۔ سیدہ عائشہ کے کہنے پر حضرت عمرو بن عاص حضرت عمر سے ملے اور کہا: میں

اس سے بہتر رشتہ تجویز کرتا ہوں، ام کلثوم بنت علی۔ ان سے شادی کر کے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزہ میں شامل ہو جائیں گے۔ حضرت علی نے کہا: ام کلثوم تو ابھی بچی ہے۔ حضرت عمر نے کہا: ابوالحسن! آپ اسے بیاہ دیں، میں اس کی تکریم کروں گا۔ ان کے اصرار کو دیکھتے ہوئے حضرت علی نے چالیس ہزار مہر کے عوض نکاح کر دیا۔ حضرت عمر نے مہاجرین کی ایک مجلس میں یہ کہہ کر خوشی کا اظہار کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روز قیامت میرے نسب اور سسرال کے علاوہ تمام نسبی و سسرالی رشتہ داریاں ختم ہو جائیں گی۔ ام کلثوم بنت علی سے حضرت عمر کے دو بچے رقیہ اور زید (اکبر) پیدا ہوئے۔

طاعون عمواس

۱۸ھ میں شام (اب فلسطین) کے علاقے عمواس میں طاعون کی وبا پھوٹی تو حضرت عمر نے خود وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ کعب احبار نے ان سے کہا: عراق سے دورے کی ابتدا نہ کرنا جو لاعلاج بیماریوں کا گڑھ ہے اور وہاں شیطان اپنے سینگ سمائے ہوئے ہے۔ حضرت علی بولے: کوفہ ہجرت کے بعد ہجرت کرنے کی جگہ ہے۔ ایک دن آئے گا کہ ہر مسلمان وہاں جانے کی آرزو کرے گا۔ روانہ ہونے سے پہلے حضرت عمر نے حضرت علی کو مدینہ کا قائم مقام حاکم مقرر کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جنگ نہاوند

۲۱ھ (۶۴۲ء) میں جنگ نہاوند سے پہلے حضرت عمر نے صحابہ سے مشورہ کیا، میرا ارادہ ہے کہ فوج کے ساتھ آگے جاؤں اور کوفہ و بصرہ کے بیچ ڈیرا ڈال کر فوجیوں کا پشتی بان بنوں۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ نے کہا: اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنائیں۔ حضرت عثمان نے رائے دی، شام، یمن، مکہ اور مدینہ سے فوجیں جمع کر کے خود دشمن کا مقابلہ کریں۔ آپ کے نکلنے سے غنیم کا عدد کثیر بھی کم معلوم ہو گا اور آپ ہی غالب رہیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے محاذ جنگ پر نہ جانے کا مشورہ دیا۔ حضرت علی کی باری آئی تو انھوں نے کہا: امیر المومنین! آپ کی مثال موتیوں کی لڑی کی ہے جو موتیوں کو پرو کر اکٹھا رکھتی ہے۔ جب وہ ٹوٹے تو تمام موتی بکھر کر ضائع ہو جاتے ہیں اور ان کا دوبارہ جمع ہونا محال ہو جاتا ہے۔ عرب آج قلیل ہونے کے باوجود اسلام کی وجہ سے طاقت ور ہیں۔ اگر آپ خود مدینہ سے نکل آئے تو چہار اطراف سے یورش ہو جائے گی تب ملک کی سرحدوں اور اہل و عیال کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے لوگوں کو اپنے شہروں میں رہنے دیں اور اہل بصرہ کو تین حصوں میں بٹ جانے کا حکم دیں، ایک حصہ اہل و عیال کی حفاظت کرے، ایک معاہد اقوام (ذمیوں) کی

نگرانی کرے اور تیسرا گروہ اہل کوفہ کی فوج میں شامل ہو جائے۔ جہاں تک دشمن کی عددی برتری کا سوال ہے، ہم نے ماضی میں بھی تعداد کی بنا پر نہیں، بلکہ اللہ کی نصرت سے قتال کیا ہے۔ حضرت عمر نے کہا: یہی رائے صحیح ہے، میں اسی پر عمل کروں گا۔ اب مجھے بتاؤ، کس کو سپہ سالار مقرر کروں؟ حضرت علی اور دوسرے صحابہ نے کہا: آپ خود بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں تو انھوں نے حضرت نعمان بن مقرن کو یہ ذمہ داری دے دی۔

فتح خراسان

۲۲ھ (۶۴۳ء) میں فتح خراسان کے بعد جیش اسلامی کے سالار حضرت احنف بن قیس نے مدینہ بشارت بھیجی تو حضرت عمر نے انھیں دریاے آمو (جیحون) کے ادھر رہنے کا حکم دیا اور کہا: میری خواہش تھی کہ ہمارے اور ایرانیوں کے بیچ آگ کا سمندر حائل ہوتا۔ حضرت علی نے کہا: امیر المومنین! آپ کو خراسان کی فتح ناگوار گزری ہے، حالانکہ یہ خوشی کا موقع ہے؟ جواب دیا، مجھے اندیشہ ہے کہ ایرانی عہد شکنی کر کے اس علاقے سے تین بار حملہ آور ہوں گے اور تیسری بار ان کی تباہی ہو گی۔ میں چاہتا ہوں، ان کی بربادی ان کے اپنے ہاتھوں ہو۔

حضرت عمر کی شہادت

۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو حضرت عمر فجر کی نماز پڑھانے مسجد نبوی میں آئے۔ ابھی صفیں سیدھی نہ ہوئی تھیں کہ ابولؤلؤہ اچانک ان پر حملہ آور ہوا، اس نے کٹار سے چھ وار کیے، ایک زیر ناف لگا۔ حضرت عمر چلائے، پکڑو! اس نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ لوگ لپکے تو اس نے خنجر گھمایا اور مزید بارہ افراد کو شدید زخمی کر دیا جن میں سے چھ موقع پر شہید ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن عوف نے چغہ پھینک کر اسے قابو کیا۔ حضرت عمر کے کہنے پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی۔ جانبری کی امید نہ رہی تو فرمایا: میں ان اصحاب عشرۂ مبشرہ سے زیادہ کسی کو خلافت کا حق دار نہیں سمجھتا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوتے وقت راضی تھے۔ اہل ایمان ان میں سے جس کو چن لیں گے وہی خلیفہ ہو گا، تم سب اس کی سمع و طاعت کرنا۔ پھر حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص کے نام لیے۔ انھوں نے ساتویں زندہ صحابی حضرت سعید بن زید کو شامل نہ کیا، کیونکہ وہ ان کے قبیلہ بنو عدی سے تھے۔ حضرت علی کو ترجیح دینے کے باوجود نامزد نہ کیا، کیونکہ وہ ان کے سسر تھے۔ صحابہ نے کسی ایک کے حق میں وصیت کرنے کو کہا تو کہا: میں نے بہت غور و فکر کے بعد ایک شخص کو خلافت منتقل کرنے کا سوچا تھا (یہ کہہ کر حضرت علی کی طرف اشارہ کیا) کہ مجھ پر غشی طاری ہو گئی۔ افاقہ ہونے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ کا فیصلہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

غالب ہو گا۔ تم ان چھ اصحاب سے چپکے رہنا، یہ جسے خلیفہ چن لیں، اس سے تعاون کرنا۔

اگلے روز حضرت عمر نے اصحاب شوریٰ کو بلا کر نصیحت کی، حضرت علی سے کہا: اگر زمام خلافت تمھارے ہاتھ آئی تو اللہ کا واسطہ ہے، بنو ہاشم کو لوگوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔ اصحاب ستہ رخصت ہوئے تو کہا: اگر یہ علی کو خلافت سونپ دیں تو یہ انھیں سیدھی راہ پر ڈال دیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے پوچھا: آپ کے ایسا کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ کہا: میں پسند نہیں کرتا کہ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی یہ بار مجھ ہی پر رہے۔

حضرت عمر نے تاکید کی کہ چوتھے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے لازماً خلیفہ کا انتخاب کر لیا جائے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ علی و عثمان میں ایک کو امر خلافت ملنے کا احتمال ہے۔ عثمان میں نرم خوئی ہے، جب کہ علی میں خوش طبعی ہے، وہ امت کو جادۂ حق پر چلانے کی بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔ سعد بھی خلیفہ بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

حضرت عمر کو گھر منتقل کیا گیا تو حضرت علی ان کی عیادت کرنے گئے، وہ ان کے سرہانے بیٹھے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عباس بھی آ گئے اور حضرت عمر کے بارے میں تعریفی کلمات کہے۔ انھوں نے پوچھا: کیا تو مجھے اس ستایش کے لائق سمجھتا ہے؟ حضرت علی نے اشارہ کیا کہ ہاں کہو تو حضرت عمر بولے: تم اور تمھارے ساتھی مجھے دھوکے میں مبتلا نہ کر دیں۔ میرا سر تکیے سے ہٹا کر مٹی سے لتھ پتھ کر دو۔ ہو سکتا ہے، اللہ مجھ پر ترس کھا لے۔

حضرت عمر کی میت پر چادر پڑی ہوئی تھی۔ حضرت علی تشریف لائے تو کہا: میرے نزدیک کوئی شخص اس کفن پوش سے بہتر نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے حضور حاضر ہوں تو میرا اعمال نامہ بھی اس کے نامۂ عمل کے مشابہ ہو۔ وہ اپنا خیر لے کر رخصت ہوئے اور اپنے شر سے محفوظ ہو گئے۔

حضرت عمر کا جنازہ لایا گیا تو حضرت عثمان اور حضرت علی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے سرہانے اور پائینتی کی طرف بڑھے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے انھیں روکا اور کہا: یہ عمر کے مقررہ نائب کا کام ہے۔ چنانچہ قائم مقام خلیفہ حضرت صہیب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد اور حضرت عبداللہ بن عمر تدفین کے لیے قبر میں اترے۔

حضرت عمر کی شہادت کے روز حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت عبیداللہ بن معمر کے ہاں بیٹے پیدا ہوئے۔ تینوں کا نام عمر رکھا گیا۔

خلیفۂ سوم کا انتخاب

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب فتح مکہ سے قبل ایمان لائے تھے۔ آپ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے مرض وفات میں انھوں نے حضرت علی پر بہت دباؤ ڈالا کہ آپ سے اپنے حق میں وصیت لے لیں، لیکن وہ نہ مانے۔ آپ کے رخصت ہونے کے بعد وہ بنو ہاشم کو خلافت دلانے کے لیے سر گرم رہے۔ حضرت عمر نے اصحاب ستہ پر مشتمل مجلس انتخاب بنائی تو انھوں نے حضرت علی کو مشورہ دیا کہ اس میں شامل نہ ہوں۔ حضرت علی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا، میں اختلاف پسند نہیں کرتا۔ حضرت عباس نے کہا: تو نے اپنی خلافت پر اصرار نہ کیا تو ناپسندیدہ نتیجہ ہی دیکھے گا۔ تمھیں یہ جو بھی پیش کش کریں، نہ مانو، کیونکہ یہ شوریٰ عثمان ہی کو آگے لائے گی۔ سعد اور عبدالرحمٰن تمھیں ہر گز ووٹ نہ دیں گے۔

پہلے دو دن ارکان شوریٰ فیصلہ نہ کر پائے تو ناظم انتخاب حضرت ابو طلحہ نے اعلان کیا کہ وہ حضرت عمر کی مقررہ مہلت، تین دن سے ہر گز تجاوز نہ کریں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف جانتے تھے کہ خلافت کے دو بنیادی حق دار حضرت علی و حضرت عثمان ہیں۔ انھوں نے اپنے اس خیال کی تصدیق حضرت علی سے یہ سوال کر کے کی: سبقت الی الاسلام، قرابت رسول اور اپنی دین داری کی وجہ سے آپ خلافت کے اہل ہیں، لیکن اگر خلافت آپ کو نہ مل پائی تو آپ کے خیال میں اس منصب پر کسے بیٹھنا چاہیے؟ انھوں نے جواب دیا، عثمان کو۔ یہی بات الگ ہو کر حضرت عثمان سے پوچھی تو انھوں نے حضرت علی کا نام لیا۔ اب انھوں نے چاہا، انتخاب ان دونوں پر موقوف ہو جائے۔ چنانچہ اصحاب ستہ کو تجویز کیا کہ ان میں سے تین ان تینوں کے حق میں دست بردار ہو جائیں جنھیں وہ خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے ہیں۔ حضرت علی اور حضرت عثمان خاموش رہے تو انھوں نے حضرت علی سے پوچھا: ابوالحسن! آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت علی نے کہا: تم عہد کرو، حق کو ترجیح دو گے اور رشتہ داری کی بجاے امت سے خیر خواہی کرو گے۔ جواباً حضرت عبدالرحمٰن نے بھی عہد مانگا کہ میرے انتخاب کو مان لو گے۔ حضرت عبدالرحمٰن کے مشورہ کے مطابق حضرت زبیر حضرت علی کے حق میں، حضرت سعد حضرت عبدالرحمٰن کے اور حضرت طلحہ حضرت عثمان کے حق میں دست بردار ہو گئے تو انھوں نے ارکان شوریٰ سے دریافت کیا، کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ کا خلیفہ چنوں اور خود اس منصب سے الگ رہوں؟ حضرت علی نے کہا: (آپ جو انتخاب کریں گے) میں سب سے پہلے مانوں گا، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا ہے: ''عبدالرحمٰن! تم آسمان والوں میں امانت دار شمار ہو گے اور اہل زمین میں بھی تمھاری امانت مسلم ہے''(مستدرک حاکم، رقم ۵۳۵۴)۔ ایک روایت کے مطابق حضرت سعد نے حضرت عبدالرحمٰن پر زور دیا کہ وہ خود خلیفہ بنیں، لیکن اگر وہ علی و عثمان میں سے ایک کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں تو وہ علی کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسری روایت اس سے متضاد ہے کہ حضرت سعد نے حضرت عثمان کے حق میں راے دی۔ حضرت

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.org

عبدالرحمٰن اپنا فیصلہ فوراً صادر کر سکتے تھے، تاہم انھوں نے مدینے میں موجود اصحاب رسول، عمائدین، عوام الناس حتیٰ کہ عورتوں، بچوں، مدینہ میں وارد ہونے والے مسافروں اور بدوؤں سے بھی مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ان سب کی اکثریت نے حضرت عثمان کے حق میں راے دی۔

انتخاب کی رات حضرت ابن عوف نے ایک بار پھر حضرت علی و حضرت عثمان دونوں کو بلا کر عہد لیا کہ وہ جسے بھی خلیفہ مقرر کریں گے، عدل وانصاف سے کام لے گا اور جسے یہ ذمہ داری نہ مل پائی، سمع و طاعت کرے گا۔ پھر کبار مہاجرین وانصار اور فوج کے کمانڈروں کو فجر کی نماز پر اکٹھا ہونے کی دعوت دی۔ فجر سے پہلے انھوں نے اپنے بھانجے حضرت مسور بن مخرمہ کو حضرت عثمان اور حضرت علی کو بلانے کے لیے بھیجا۔ان کے پوچھنے پر کہا: جس کو مرضی پہلے بلا لینا۔تب حضرت علی کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ خلیفہ بننے والے ہیں۔ مسجد نبوی کھچا کھچ بھر گئی۔ نماز کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف منبر پر چڑھے۔ حضرت علی و حضرت عثمان کے مویدین میں تکرار ہونے لگی۔ حضرت عمار اور حضرت مقداد بولے: اگر اختلاف سے بچنا ہے تو علی کی بیعت کر لو۔ حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ اور ابن ابی سرح نے کہا: قریش میں تفرقہ نہیں ڈالنا چاہتے تو عثمان کا انتخاب کر لو۔ حضرت سعد پکارے: عبدالرحمٰن! قبل اس کے کہ لوگ فتنہ میں مبتلا ہوں، اس کام کو نمٹا دو۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے طویل دعا کے بعد حضرت عثمان اور حضرت علی دونوں سے کتاب اللہ، سنت رسول اور حضرت ابو بکر و حضرت عمر کے نقش ہاے قدم پر چلنے کا عہد لیا پھر حضرت عثمان کا ہاتھ تھام لیا، آسمان کی طرف سر بلند کیا اور تین بار کہا: اے اللہ! سن لے اور گواہ رہ۔ میں نے خلافت کی ذمہ داری عثمان کو سونپ دی۔ حضرت عبدالرحمٰن کے بعد ان کے پاس کھڑے حضرت علی نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر بیعت کی، پھر مسجد میں موجود سب اہل ایمان بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔(ابن سعد) دوسری روایت کے مطابق حضرت علی نے تاخیر کی اور حضرت عبدالرحمٰن کے پکارنے پر بیعت کے لیے لوٹے۔ (طبری) ابو وائل نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے پوچھا: آپ نے کیونکر عثمان کی بیعت کر لی اور علی کو چھوڑ دیا؟ حضرت عبدالرحمٰن نے کہا: اس میں میرا کوئی گناہ نہیں۔ میں نے علی سے ابتدا کی اور کہا: میں کتاب اللہ، سنت نبوی اور سیرت ابو بکر و عمر پر آپ کی بیعت کرتا ہوں تو انھوں نے کہا: میں ابو بکر و عمر کی ان باتوں میں پیروی کروں گا جو میرے لیے ممکن ہوئیں۔ یہی کلمات عثمان کے آگے دہرائے تو انھوں نے غیر مشروط طور پر بلا تامل قبول کیے۔

حضرت عثمان سے تعاون

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کا انتخاب ہو جانے کے بعد حضرت علی نے پہلے دو

خلفاے راشدین کی طرح ان سے بھی تعاون اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا، لیکن اس کے بر عکس مفہوم پر مشتمل روایات بھی اسی تاریخ میں موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت علی نے حضرت عبدالرحمٰن سے کہا: یہ پہلا دن نہیں کہ تم نے ہم پر غلبہ پایا ہے، 'فصبر جمیل'، پس صبر خوب کرنا ہو گا۔ تم نے عثمان کو اس لیے خلیفہ بنایا ہے کہ اقتدار تمھارے پاس لوٹ آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے جواب میں کہا: علی! اپنے خلاف حجت قائم کرنے کا موقع نہ دو۔ حضرت علی یہ کہتے ہوئے نکل آئے، تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہے گا۔ حضرت مقداد بن اسود نے شکوہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اہل بیت پر کیا کچھ بیت گیا۔ علی کے علم اور ان کے عدل و قضا کو ترک کر دیا گیا ہے۔ حضرت علی نے کہا: اگر بنو ہاشم تمھارے حاکم بن گئے تو اقتدار ان سے باہر نہ نکل سکے گا اور اگر یہ دوسروں کے پاس چلا گیا تو واپس تمھارے پاس آ سکتا ہے۔ حضرت مسور بن مخرمہ سے مروی ہے، حضرت عمر کی تدفین کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اہل ایمان سے خطاب کیا اور انھیں تفرقہ سے بچنے کی تلقین کی، پھر حضرت عثمان، حضرت زبیر اور حضرت سعد نے کچھ باتیں کیں۔ آخر میں حضرت علی نے یہ خطاب کیا: ہم خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھتے ہیں، خلافت ہمارا حق ہے، دے دو گے تو قبول کر لیں گے، اگر نہ دو گے تو اونٹوں کی پشتوں پر سوار ہو کر چلے جائیں گے خواہ ہماری راتوں کا سفر کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو جائے۔ حقیقت میں ایسا نہ ہوا، عہد عثمانی میں حضرت علی مدینہ ہی میں رہے اور کسی طویل سفر پر نہ نکلے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ابولؤلؤہ اور ہرمزان کا قتل

حضرت عمر کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے حضرت عبیداللہ کو معلوم ہوا کہ مدینہ میں مقیم ہرمزان نے ابولؤلؤہ فیروز کو وہ خنجر دیا تھا جس سے اس نے عمر کو شہید کیا۔ انھوں نے فرط غضب میں ابولؤلؤہ، اس کی نو عمر بیٹی لؤلؤہ، ہرمزان اور ایک عیسائی جفینہ کو قتل کر ڈالا۔ نو منتخب خلیفۂ سوم حضرت عثمان ان مقتولین کا قصاص لینا چاہتے تھے، حضرت علی نے ان کی تائید کی۔ ایک مہاجر نے کہا: کل عمر شہید ہوئے، آج ان کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے؟ حضرت عمرو بن عاص نے کہا: یہ قتل عثمان کے عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہو چکے تھے اس لیے ان پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ حضرت عثمان نہ مانے اور ہرمزان کے بیٹے سے قصاص لینے کو کہا۔ اس نے معاف کر دیا تو انھوں نے جفینہ اور ابولؤلؤہ کی بیٹی کی دیت اپنی جیب سے ادا کر دی۔ ابن اثیر کہتے ہیں، ہرمزان کے بیٹے غمادیان نے خون معاف نہ کیا تھا۔ اسی لیے حضرت علی نے خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت عبیداللہ بن عمر کو قصاص میں قتل کرنے کا حکم جاری کیا، لیکن وہ بھاگ کر شام چلے گئے جہاں حضرت معاویہ کی حکمرانی تھی۔

قضا و عدل

حضرت علی عہد عثمانی میں بھی عدالتی فیصلوں کا حصہ رہے۔ لوگ اپنے تنازعات لے کر حضرت عثمان کے پاس آتے تو وہ ایک فریق سے کہتے کہ علی کو بلا لاؤ اور دوسرے کو حضرت طلحہ و حضرت زبیر کو بلانے بھیج دیتے۔ فریقین کے بیانات سننے کے بعد ان حضرات سے راے لیتے۔ اگر ان کی راے ان کے خیال کے موافق ہوتی تو فوری فیصلہ نافذ کر دیتے۔ دوسری صورت میں مزید غور و فکر کرنے کے بعد حکم جاری کرتے۔ حضرت علی نے حدود و میراث کے متعدد فیصلوں میں اپنا ماہرانہ مشورہ دیا۔

عطیات و ہدایا

خلیفۂ سوم کے زمانے میں جو عطیات اور ہدایا مفتوحہ ممالک سے آتے حضرت علی انھیں قبول کرتے رہے۔

تراویح

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عثمان کے دور خلافت میں حضرت علی نماز تراویح کی امامت کرتے رہے۔ تاہم انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے چند راتوں کے بعد یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔

حج کے موقع پر قصر کا ترک کرنا

۲۹ھ میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان امیر حج تھے۔ انھوں نے پہلی بار منیٰ میں خیمہ لگایا اور منیٰ و عرفات میں قصر کیے بغیر پوری چار رکعتیں پڑھائیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان پر تنقید کی گئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے نکیر کی، حضرت علی نے کہا: کوئی نیا حکم آیا ہے نہ عہد نبوی اتنا قدیم ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر و عمر نے دو رکعتیں پڑھائیں اور آپ بھی ابتداے خلافت سے قصر کرتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا، (خلافت کے چھٹے سال) کیا طریقہ اپنا لیا ہے؟ حضرت عثمان نے کہا: یہ ایک اجتہاد ہے جو میں نے کیا ہے، کیونکہ یمن کے کچھ حجاج نے میرے قصر کرنے سے سمجھ لیا کہ نماز اصل میں دو رکعت ہی ہے۔ پھر مکہ میں میرا اسسرال ہے اور طائف میں میرے مویشی ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بہت بحث کی اور ان کے تمام دلائل کو رد کیا، لیکن وہ اپنی راے پر قائم رہے۔ حضرت علی کا اختلاف برقرار رہا، لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے معاملے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور خود بھی چار رکعتیں پڑھانا شروع کر دیں۔

حج قران سے روکنا

حضرت مقداد بن اسود مدینہ کے کنویں سقیا (سقیۃ: القاموس المحیط) پر پہنچے جہاں حضرت علی اپنی اونٹنیوں کو درختوں سے جھاڑے ہوئے پتے کھلا رہے تھے اور آٹا ملا ہوا پانی پلا رہے تھے اور کہا: دیکھیں عثمان بن عفان حج و عمرہ ایک ساتھ کرنے سے منع کرتے ہیں۔ حضرت علی اسی حالت میں نکل آئے کہ آٹا اور پتے ان کے ہاتھوں پر لگے تھے، سیدھا حضرت عثمان کے پاس پہنچے اور پوچھا: آپ حج قران کرنے سے روک رہے ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا: یہ میری راے ہے۔ حضرت علی غصے سے یہ کہتے پلٹ آئے، لبیک، اے اللہ! میں حج و عمرہ دونوں کے لیے لبیک کہتا ہوں (موطا امام مالک، رقم ۱۰۰۳۔ مسند احمد، رقم ۱۱۳۹)۔ اس سے ملتی جلتی دوسری روایت حج تمتع کے بارے میں ہے۔ مدینہ سے مکہ جانے والے راستے پر جحفہ اور مکہ کے درمیان واقع مقام عسفان پر حضرت عثمان کی حضرت علی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا: کیا بات ہے آپ لوگوں کو حج تمتع سے روکتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تمتع کیا ہے؟ حضرت عثمان نے لاجواب ہو کر کہا: ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجیے (بخاری، رقم ۱۵۶۹۔ مسلم، رقم ۲۹۵۴۔ مسند احمد، رقم ۱۱۴۶)۔ حضرت علی نے حج قران کیا، انھوں نے یمن سے چلتے وقت نیت کی، میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم والے احرام کی نیت کرتا ہوں۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے بتایا کہ میں نے عمرہ و حج، دونوں کی نیت کی ہے۔ اگر تمھارے پاس ہدی ہے تو یہی نیت کر لو۔ آپ کی وفات کے بعد بھی حضرت علی عمرہ و حج، دونوں کی نیت سے احرام باندھتے اور کہتے، میں کسی فرد واحد کے کہنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں چھوڑ سکتا (بخاری، رقم ۱۵۶۳)۔ حضرت عثمان تمتع و قران دونوں کو جائز نہ سمجھتے تھے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حج تمتع روا رکھنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ تب ہم خوف زدہ تھے (مسلم، رقم ۲۹۳۴)۔ سیوطی نے اس کے معنی بتائے، ہمیں خدشہ تھا کہ دوبارہ سفر کے لیے نکلنا مشکل ہو گا۔ ابن کثیر کہتے ہیں: یہ حضرت عثمان کا گمان تھا۔ صحابہ کی روایات تو صحیح و مقبول ہوتی ہیں، لیکن ان کا گمان حجت نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ حج تمتع اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھا، تمھیں اس کی اجازت نہیں (مسلم، رقم ۲۹۴۰)۔ شوکانی نے اس پر یہ تبصرہ کیا: حضرت ابوذر کا یہ قول لائق احتجاج نہیں، کیونکہ یہ سنت صریحہ کے خلاف ہے اور چودہ صحابہ کی صحیح روایات اسے غلط ثابت کرتی ہیں (نیل الاوطار: باب فسخ الحج الی العمرہ)۔ حضرت ابوذر کی دوسری روایت میں لفظ 'متعتان' تثنیہ ہے، یعنی حج تمتع اور عورتوں سے متعہ کرنا ہمارے ساتھ خاص تھے (مسلم، رقم ۲۹۳۹)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف کی وفات

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے وفات سے پہلے جنگ بدر میں حصہ لینے والے ہر صحابی کو چار سو دینار دینے کی وصیت کی۔ سو زندہ بدریوں میں حضرت عثمان اور حضرت علی بھی تھے۔ حضرت علی نے کہا: اے ابن عوف! رخصت ہوں، آپ نے دنیا کا عمدہ حصہ پا لیا اور اس کے کھوٹ سے محفوظ رہے۔

حضرت ولید بن عقبہ پر حد

دو اشخاص ابوزینب اور ابوموِرع نے گورنر کوفہ حضرت ولید بن عقبہ کے خلاف گواہی دی کہ انھوں نے شراب نوشی کی ہے۔ سیدنا عثمان نے انھیں مدینہ طلب کیا، الزام ثابت ہونے پر حضرت علی سے کہا: اس کی بنیان اتار کر اسے کوڑے لگاؤ، انھوں نے حضرت حسن سے کہہ دیا۔ حضرت حسن کا جواب تھا: امور خلافت میں سے مشکل (اور گرم) کام اسی کو دیں جس نے آسان (اور ٹھنڈے) کام اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ تب انھوں نے حضرت عبداللہ بن جعفر کو کہا۔ انھوں نے کوڑے لگائے اور حضرت علی نے چالیس تک گنتی پوری کی (مسلم، رقم ۴۴۵۷) پھر کہا: رک جاؤ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر نے چالیس کوڑوں کی سزا دی، جب کہ عثمان نے اسی کوڑے لگوائے ہیں۔ دونوں سنت ہیں، لیکن مجھے چالیس کا عدد پسند ہے۔ یہ حضرت علی کے اپنے مشورے کے خلاف تھا جو انھوں نے حضرت ابوبکر کو دیا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سبائی فتنہ

۳۵ھ: ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور حجاز، بصرہ، کوفہ اور شام جگہ جگہ یہ پراپیگنڈا کرتا پھرا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی لوٹ کر آئیں گے۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور محمد کے وصی علی ہیں۔ عثمان نے ان کا حق سلب کر رکھا ہے، ان کے عمال پر طعن زنی کر کے عوام کو اپنی جانب مائل کر لو۔ ان حالات میں اگلے خلیفہ کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کچھ لوگ حضرت علی کے حق میں تھے، کچھ حضرت زبیر و حضرت طلحہ کی حمایت کرتے تھے، باقی حضرت معاویہ کی خلافت کو شدنی سمجھنے لگے۔

حضرت عثمان کے خلاف بغاوت

ایک بار حضرت علی نے کوفہ میں خطاب کیا، اسی دوران میں ایک شخص کھڑا ہو کر حضرت عثمان کو برا بھلا کہنے لگا کہ انھوں نے لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیا ہے۔ حضرت علی چلائے: خاموش ہو جا! انھوں نے ہم

سب کے مشورے سے ایسا کیا ہے۔ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو انھوں نے کیا ہے۔

۳۴ھ میں لوگوں نے حضرت عثمان پر کھلے عام تنقید کرنا شروع کی۔ صحابہ میں سے حضرت زید بن ثابت، حضرت ابواسید ساعدی، حضرت کعب بن مالک اور حضرت حسان بن ثابت انھیں منع کرتے۔ معترضین نے اپنے اعتراضات حضرت علی کو پیش کیے تو وہ حضرت عثمان کے پاس گئے اور کہا: سمجھ میں نہیں آتا، کیا کہوں؟ ابوبکر و عمر حق اور خیر بجالانے میں آپ سے برتر نہ تھے۔ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کے ساتھ داماد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ آپ ہر بات بخوبی سمجھتے ہیں، اپنے معاملات میں اللہ کا خوف کریں۔ اللہ کا بہترین بندہ امام عادل ہے، خود ہدایت پر ہوتا ہے اور ہدایت کا سبب بنتا ہے۔ معروف سنتوں کا احیا کرتا ہے اور متروک بدعتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس ظالم حکمران بدترین خلائق سمجھا جاتا ہے، گم راہ ہوتا ہے اور دوسروں کو گم راہ کرتا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: روز قیامت ظالم حاکم اس حال میں لایا جائے گا کہ کوئی اس کی طرف سے معذرت کرے گا نہ اس کی مدد کو آئے گا اور اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ حضرت عثمان نے جواب دیا: میں آپ کی جگہ ہوتا تو ہرگز عیب جوئی نہ کرتا۔ میں نے صلۂ رحمی کی ہے، اہل حاجت کی حاجات پوری کی ہیں، بے کس کو ٹھکانا دیا ہے۔ کیا عمر نے اپنے اقربا میں سے مغیرہ بن شعبہ کو ذمہ داری نہیں سونپی؟ میں نے ابن عامر کو قرابت داری کی بنا پر عہدہ دیا تو مجھے ملامت کرتے ہیں؟ حضرت علی نے کہا: عمر اپنے والیوں کے کان مروڑتے اور ان کی غلطیوں پر کڑی سزا دیتے تھے، جب کہ آپ اپنے اعزہ سے نرم خوئی کرتے ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا: مطعونین آپ کے بھی اعزہ ہیں۔ حضرت علی نے کہا: درست، لیکن حکمرانی کی قابلیت دوسرے لوگوں میں ہے۔ حضرت عثمان بولے: کیا عمر نے پوری مدت خلافت کے دوران میں معاویہ کو گورنر مقرر نہیں کیا؟ میں نے ان کی گورنری برقرار رکھی ہے۔ حضرت علی نے کہا: صحیح، آپ خود بتائیں، معاویہ عمر کے غلام یرفا سے کہیں زیادہ ان سے نہ ڈرتے تھے؟ حضرت عثمان نے تائید کی تو حضرت علی نے کہا: معاویہ اب آپ سے پوچھے بغیر فیصلے کر رہے ہیں، آپ سے منسوب کرتے ہیں اور آپ کچھ نہیں کہتے۔ حضرت علی کے جانے کے بعد حضرت عثمان نے ایک خطبہ دیا جو بلاغت کا شاہ کار ہے۔ انھوں نے کہا: عیب جو اور طعنہ زن اس امت کے لیے ایک آفت ہیں۔ عمر تمھیں پاؤں سے روندتے، ہاتھ سے تھپڑ جڑتے اور سخت گفتگو کر کے دبا لیتے تو تم ان کی ہر صحیح و غلط بات مان لیتے۔ میں نے تمھارے لیے کندھے پست کر دیے، تم پر دست درازی کی نہ زبان طعن کھولی، اس لیے مجھے بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہو۔ میں مال زائد میں تصرف نہیں کر سکتا تو امام کس بات کا ہوا؟

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

۳۵ھ کا حج

اپنی زندگی کے آخری سال حضرت عثمان حج پر نہ جا سکے۔ حاجیوں کو رخصت کر کے مدینہ آئے تو حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو بلایا۔ حضرت معاویہ نے جوان کے پاس پہلے سے بیٹھے تھے، یوں گفتگو شروع کی۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں، اس امت کے امور کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ کسی دباؤ اور لالچ کے بغیر آپ نے عثمان کو خلیفہ چنا ہے، اب لوگوں کو اپنی خلافت کی طمع نہ دلائیں۔ حضرت علی نے کہا: کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اب حضرت عثمان بولے: میری راے میں ابوبکر و عمر نے احتساب کے نام پر اپنے اوپر سختی کی اور اپنے رشتہ داروں پر ظلم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے قرابت داروں کو دیتے دلاتے تھے۔ میرا خاندان تنگ دست اور محتاج ہے، پھر بھی اگر آپ لوگ ان پر کی ہوئی عطاؤں کو غلط سمجھتے ہیں تو میں لوٹا لیتا ہوں۔ پھر ان صحابہ کے کہنے پر عبداللہ بن خالد کو دیے ہوئے پچاس ہزار اور مروان کو عطا کردہ پندرہ ہزار درہم واپس لیے۔ حضرت معاویہ رخصت ہونے لگے تو حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے پاس سے پھر گزرے اور کہا: میں تم میں ایک بزرگ (عثمان) کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ ان سے اچھا سلوک کرنا اور ان کا ساتھ دینا، سعادت مزید پاؤ گے۔ حضرت علی نے کہا: مجھے معاویہ کی اس تنبیہ میں خیر نظر نہیں آیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

باغی گروہ

۳۵ھ ہی میں حضرت عثمان کے خلاف خروج ہوا، خارجی تین گروپوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ بصرہ سے آیا اور مدینہ سے باہر ذوخشب کے مقام پر ڈیرا ڈال دیا، کوفہ سے آنے والے طاغیوں کے دوسرے ٹولے نے اعوص پر پڑاؤ ڈالا، جب کہ تیسرا گروپ مصر کے خارجیوں پر مشتمل تھا جس نے ذوالمروہ پر مقام کیا۔ مصر والے حضرت علی کو، بصرہ والے حضرت طلحہ اور کوفی حضرت زبیر کو اگلا خلیفہ دیکھنا چاہتے تھے۔ پہلے دو باغی زیاد بن نصر اور عبداللہ بن اصم مدینہ آئے، امہات المومنین، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر سے ملاقات کی اور کچھ گورنروں کے استعفا کا مطالبہ کیا۔ پھر مصری حضرت علی کے پاس آئے، اہل بصرہ حضرت طلحہ سے ملے اور کوفیوں نے حضرت زبیر کا رخ کیا۔ حضرت علی مدینے کے مقام احجار زیت میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز استسقا پڑھائی تھی، تلوار حمائل کیے ایک لشکر میں موجود تھے۔ باغیوں کو دیکھتے ہی چلائے: نیک اہل ایمان جانتے ہیں، ذوالمروہ، ذوخشب اور اعوص کی فوجوں پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے لعنت بھیجی گئی ہے۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر نے بھی اپنے پاس آنے والوں پر ڈانٹ پھٹکار کی تو باغی ان سے

مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ حضرت عثمان نے حضرت عمرو بن عاص کو مصر کی گورنری سے ہٹایا تو وہ بھی حضرت عثمان کے خلاف سر گرم ہو گئے۔ انھوں نے حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو بھی ان کے خلاف اکسایا۔

حضرت علی کی طرف سے دفاع

خارجیوں نے مدینہ سے باہر ذو خشب پر ڈیرے ڈالے تو حضرت عثمان حضرت علی کے گھر آئے اور کہا: اے چچازاد! میری آپ سے قریب کی رشتہ داری ہے اور میں آپ پر بڑا حق رکھتا ہوں۔ باغی بھی آپ کی قدر کرتے ہیں اور آپ کی بات سنتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ انھیں شہر میں داخل ہونے سے روکیں۔ حضرت علی نے پوچھا: کس وعدے پر ان کو منع کروں؟ حضرت عثمان نے جواب دیا: میں آپ کے سجھاؤ اور مشورے پر عمل کروں گا۔ علی نے کہا: میں نے بارہا گفتگو کر کے دیکھا ہے، ہم ایک بات طے کرتے ہیں اور آپ اس سے پھر جاتے ہیں۔ سب مروان، عبداللہ بن عامر، معاویہ اور ابن سعد (یا ابن ابی سرح) کا کیا دھرا ہے۔ آپ ان کے پیچھے چلتے ہیں اور میری ایک نہیں سنتے۔ حضرت عثمان نے کہا: میں آپ کی مانوں گا اور ان کی نہ سنوں گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آخر کار حضرت علی تیس سر کردہ مہاجرین و انصار کو لے کر نکلے، حضرت سعید بن زید، حضرت حکیم بن حزام، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت ابو اسید ساعدی، حضرت زید بن ثابت، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن مالک ان میں شامل تھے۔ حضرت عمار ان کے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئے۔ حضرت علی اور حضرت محمد بن مسلمہ نے مصر کے باغیوں سے گفتگو کی۔ باغیوں نے ابن ابی سرح کے مظالم کی شکایت کی اور کہا کہ وہ مال غنیمت اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت عثمان پر بھی الزامات لگائے جن کا حضرت علی نے بھرپور دفاع کیا۔ انھوں نے کہا: امیر المومنین نے چراگاہ اپنے ڈھور ڈنگروں کے لیے نہیں، بلکہ بیت المال کے اونٹوں کے لیے بنائی جیسا ان سے پہلے عمر بنا چکے تھے۔ انھوں نے مصحف کے وہ نسخے جلائے جو مختلف فیہ تھے اور متفق علیہ باقی رہنے دیے۔ انھوں نے مکہ میں کامل نماز اس لیے ادا کی، کیونکہ وہاں ان کا سسرال تھا اور وہ قیام کی نیت رکھتے تھے۔ حضرت عثمان نے نوعمر گورنر اس لیے مقرر کیے، کیونکہ وہ ذی صلاحیت اور عادل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بیس سالہ عتاب بن اسید کو مکہ کا گورنر اور ایک نوجوان اسامہ بن زید کو سپہ سالار مقرر فرمایا تھا۔ سیدنا عثمان نے اگر اپنی قوم بنو امیہ کو ترجیح دی تو کیا ہوا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قوم قریش کو باقیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ الزام بھی غلط ہے کہ عثمان نے حکم بن عاص کی جلاوطنی ختم کی، اسے خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف بھیجا اور پھر واپس بلا لیا تھا۔

باغی بظاہر مطمئن ہو کر واپس چلے گئے تو حضرت علی نے واپس آ کر حضرت عثمان سے کہا: لوگوں سے خطاب کر کے انھیں اپنے اخلاص وامانت پر گواہ بنائیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کوفہ و بصرہ کے باغی آ ٹپکے تو بھی آپ مجھے ہی ان کے پاس بھیجیں گے۔ حضرت عثمان نے لوگوں کے سامنے اس انداز سے توبہ و رجوع کیا کہ سب رونے لگے۔ انھوں نے مروان اور اس کے ساتھیوں کو کنٹرول کرنے کا وعدہ بھی کیا، تاہم کچھ ہی دیر بعد انھی سے اجازت لے کر مروان گھر سے نکلا اور باہر موجود مجمع کو برا بھلا کہہ کر منتشر کر دیا۔ حضرت علی کو خبر ملی تو یوں شکوہ کیا: اے اللہ کے بندو، اے مسلمانو! اگر میں گھر میں بیٹھا رہوں تو عثمان کہتے ہیں: تو نے مجھے چھوڑ دیا اور حق قرابت ترک کر دیا۔ اور اگر کوئی مشورہ دیتا ہوں اور عثمان اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو مروان اسے بازیچہ بنا لیتا ہے۔ عثمان کبر سنی اور صحبت رسول کا شرف رکھنے کے باوجود اس کے ہاتھوں مال مویشی بن گئے ہیں۔ وہ جدھر چاہتا ہے، انھیں ہانک لے جاتا ہے۔ پھر وہ حضرت عثمان کے گھر پہنچے اور غصے سے کہا: مروان آپ کو عقل و دین سے منحرف کر کے ہی راضی ہو گا۔ میں آپ سے جھگڑنے دوبارہ نہ آؤں گا۔ ان کے جانے کے بعد حضرت عثمان کی اہلیہ نائلہ نے کہا: مروان نے ہمیشہ آپ کو برباد ہی کیا ہے۔ عوام میں بھی اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں، اس لیے آپ علی کو راضی کریں۔ حضرت عثمان کا پیغام ملنے کے باوجود حضرت علی نہ آئے تو وہ رات کے وقت خود ان کے گھر گئے۔ انھوں نے ان کو منانے کی بہت کوشش کی اور شکوہ کیا کہ آپ نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور لوگوں کو میرے خلاف جرات دے دی ہے۔ حضرت علی نے کہا: میں نے آپ کا بہت دفاع کیا، لیکن جب بھی آپ کی بھلائی کی بات کرتا ہوں، مروان کچھ اور سجھا دیتا ہے اور آپ اس پر عمل کر لیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عثمان کے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا اور ان کے گھر اسی وقت آئے جب بلوائیوں نے ان کا پانی بند کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بلوائیوں کا پلٹ آنا

حضرت علی کے اطمینان دلانے کے بعد باغی اپنے شہروں کو واپس چلے گئے تو اہل مدینہ نے سکھ کا سانس لیا لیکن کچھ ہی روز کے بعد وہ پھر مدینہ آ دھمکے۔ حضرت علی اور حضرت محمد بن مسلمہ نے پوچھا: تم ایک بار جانے کے بعد دوبارہ کیوں آ گئے ہو؟ انھوں نے کہا: جب سیدہ عائشہ اور حضرت علی کے اصرار پر حضرت عثمان نے گورنر مصر ابن ابی سرح کو معزول کر کے محمد بن ابو بکر کو گورنر بنانے کا فرمان جاری کر دیا تو ہم مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ مدینہ سے تین روز کی مسافت طے کرنے کے بعد بویب کے مقام پر پہنچے تو حضرت عثمان کا غلام ابواعور سلمی بیت المال کے اونٹ پر جاتا ہوا ملا۔ ہم نے اس کی تلاشی لی تو یہ خط ملا جس پر مہر خلافت

ثبت ہے اور اس میں خلیفہ کی طرف سے گورنر مصر کو حکم دیا گیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عدیس، عمرو بن حمق، عروہ بن حمق، سودان بن حمران اور عروہ بن نباع (یا بیاع) کو قتل کر دیا جائے، سولی پر لٹکایا جائے یا انھیں قید کر کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائے اور سر اور ڈاڑھی کے بال منڈوا دیے جائیں۔ بصرہ اور کوفہ کو رجوع کرنے والے بلوائی بھی عین اسی موقع پر لوٹ آئے۔ ان کی حضرت طلحہ اور حضرت زبیر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے وہی الزامات دہرائے جو مصری عائد کر چکے تھے۔ حضرت علی نے سوال کیا: تمھیں اہل مصر سے ہونے والے معاملے کا کیسے پتا چلا، جب کہ تم الگ الگ کئی مراحل دور سفر کر رہے تھے؟ لگتا ہے تم نے یہ منصوبہ جانے سے پہلے مدینہ ہی میں بنالیا تھا۔ وہ بولے: آپ جو مرضی کہہ لیں، ہم عثمان کو ہٹا کر رہیں گے۔ حضرت علی نے چلا کر کہا: اللہ کے نیک بندے جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ذی مروہ اور ذی خشب کے لشکروں پر لعنت کی گئی ہے۔ لوٹ جاؤ! اللہ تمھاری صبح برباد کرے۔ حضرت زبیر نے کوفیوں کو ایسا ہی جواب دیا، حضرت طلحہ نے اپنے پاس آنے والے بصریوں کو دھتکار دیا۔

باغیوں نے حضرت محمد بن مسلمہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اور حضرت علی اس مسئلہ پر حضرت عثمان سے بات کریں۔ سیدنا عثمان نے تسلیم کیا کہ ابو اعور انھی کا غلام ہے، اونٹ بھی ان کا ہے، مہر بھی ان کی ہے، لیکن نہ خط انھوں نے لکھوایا نہ غلام کو بھیجا نہ اسے سواری دی۔ حضرت علی اور حضرت ابن مسلمہ نے کہا: عثمان سچ کہتے ہیں، یہ مروان کی کارستانی ہے۔ اس نے یہ خط حضرت عثمان سے اجازت لیے بغیر ان کے قلم سے، مہر خلافت لگا کر از خود لکھا تھا۔ وہ سورۂ مائدہ کی اس آیت پر عمل کرنا چاہتا تھا: 'اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَسۡعَوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ يُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ يُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ'، ''بے شک ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد مچاتے پھریں، یہی ہے کہ بری طرح قتل کر دیے جائیں، سولی چڑھا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے'' (۵: ۳۳)۔ یہ درست ہے کہ بلوائی خلافت اسلامیہ کے باغی اور فساد فی الارض کے مرتکب تھے اور ایسے ہی لوگوں پر آیت محاربہ کے احکامات لاگو ہوتے ہیں، تاہم مروان حاکم مجاز تھا نہ اسے حق تھا کہ قرآن کے احکام کو پورا کرنے کے لیے جعل سازی سے کام لیتا۔ حضرت علی اور دوسرے صحابہ گھروں کو لوٹے تو باغیوں نے حضرت عثمان کے گھر کو محاصرے میں لے لیا۔

محاصرے کے بعد جمعہ کا دن آیا تو سیدنا عثمان گھر سے نکلے، نماز پڑھائی پھر منبر پر کھڑے ہو کر کہا: اہل مدینہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کو علم ہے کہ تم بلوائیوں پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے ذریعے سے لعنت کی گئی ہے لہٰذا اپنی غلطی کی اصلاح کر لو۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے ان کی بات کی تائید کی تو باغی لیڈر حکیم بن حبلہ نے انھیں بٹھا دیا۔ حضرت زید بن ثابت کھڑے ہوئے تو دوسرے طاغی محمد بن ابو قتیرہ نے انھیں بیٹھنے کو کہا۔ سب نمازی اٹھ کھڑے ہوئے تو سرکشوں نے پتھراؤ شروع کر دیا۔ نمازی سنگ باری سے مسجد سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ ظالموں نے حضرت عثمان پر بھی پتھر برسائے تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ انھیں گھر منتقل کر دیا گیا۔ حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر حضرت عثمان کی عیادت کرنے آئے تو ان کے پاس بیٹھے ہوئے بنو امیہ کے افراد نے جن میں مروان نمایاں تھا، باغیوں کی اس کارروائی کا الزام ان پر دھر دیا۔ وہ غصہ سے لوٹ آئے۔ محاصرہ کو ایک ماہ گزر گیا تو بلوائیوں نے حضرت عثمان کو مسجد نبوی میں نماز پڑھانے سے روک دیا۔ مسجد کے مؤذن حضرت سعد قرظ حضرت علی کے پاس آئے اور پوچھا: نماز کون پڑھائے گا؟ انھوں نے کہا: خالد بن زید (ابوایوب انصاری) کو بلاؤ۔ چنانچہ کچھ دن انھوں نے امامت کی۔ دوسری روایت کے مطابق یہ ذمہ داری انھوں نے حضرت سہل بن حنیف کو سونپی جو یکم ذی الحجہ سے دس ذی الحجہ تک نماز پڑھاتے رہے۔ عید الاضحیٰ کی نماز حضرت علی نے پڑھائی، حضرت عثمان کی شہادت تک وہی امامت کرتے رہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صورت حال گھمبیر ہو گئی تو حضرت عثمان اور ان کے مشیروں نے فیصلہ کیا، باغیوں کے کچھ مطالبات مان لیے جائیں۔ حضرت علی سے پھر مدد چاہی گئی۔ انھوں نے کہا: باغی زبانی تسلیوں پر مطمئن نہ ہوں گے۔ وہ آپ کو قتل کرنے کے بجائے آپ سے انصاف پانا چاہتے ہیں۔ پہلے آپ نے ان سے وعدے کر کے پورے نہیں کیے، اس مرتبہ ایسا نہ کرنا۔ چنانچہ دونوں نے مل کر ایک تحریر کی کہ ہر زیادتی کا مداوا کیا جائے گا اور ان تمام عمال کو معزول کر دیا جائے گا جنھیں لوگ اچھا نہیں سمجھتے۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے لیے مدینہ میں تین دن اور دوسرے شہروں میں اطلاع پہنچنے تک کی مدت مقرر ہوئی۔ تین دن کے بعد بھی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو بلوائیوں نے حصار سخت کر دیا اور اپنے مطالبات پورا کرنے پر زور دیا۔ تب حضرت عثمان نے کہا: اگر میں تمھاری مرضی سے عامل مقرر کروں اور تمھارے مطالبے ہی پر انھیں معزول کر دوں تو امارت میری تو نہ ہوئی، تمھاری ہو گئی۔ بلوائیوں نے کہا: مانگیں پوری کرو یا خلافت چھوڑ دو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ حضرت عثمان نے حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو بلا لیا اور بلوائیوں اور اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو تلوار تمھاری اپنی گردنوں کے درپے ہو جائے گی اور اللہ تمھارا باہمی اختلاف کبھی ختم نہ کرے گا۔ خطاب کے بعد حضرت عثمان نے اہل مدینہ کو قسم دی کہ وہ لوٹ جائیں، خود وہ گھر میں بند ہو گئے۔

محاصرے کے اٹھارویں دن دوسرے شہروں سے فوجیں آنے کی اطلاع آئی تو بلوائیوں نے حضرت عثمان کے گھر کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔ کسی کو ان سے ملاقات کرنے دیتے نہ خوراک اور پانی پہنچانے دیتے۔ حضرت عثمان نے حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور امہات المومنین کو خبر کی تو سب سے پہلے حضرت علی اور ام المومنین حضرت حبیبہ حرکت میں آئے۔ حضرت علی منہ اندھیرے پہنچے اور غذا اور پانی بند کرنے پر سخت ناراض ہوئے۔ انھوں نے کہا: ایران و روم کے لوگ بھی قید کرتے ہیں، لیکن وہ کھلاتے پلاتے ہیں۔ ان کے انکار پر انھوں نے اپنا عمامہ حضرت عثمان کے گھر پھینکا، حضرت طلحہ کو ہدایت کی کہ حضرت عثمان کے گھر پانی کے مشکیزے پہنچائے جائیں اور خود چلے گئے۔

باغیوں نے حضرت علی کی نگرانی کے لیے خالد بن ملجم، حضرت طلحہ پر سودان بن حمران اور حضرت زبیر پر قتیرہ کو نگران مقرر کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر گھر سے نکلے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ ان اصحاب کے لیے حضرت عثمان کے پاس آنا مشکل ہو گیا تو انھوں نے اپنے بیٹے ان کے گھر بھیج دیے۔ چنانچہ حضرت حسن، حضرت ابن عباس، حضرت محمد بن طلحہ، حضرت عبد اللہ بن زبیر اور چند نوجوان پہرا دینے کے لیے موجود رہے۔

ایک شاذ روایت میں بیان کیا گیا ہے، خلیفۂ سوم کے گھر کے محاصرے کے وقت حضرت علی خیبر میں تھے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ لوگ حضرت طلحہ کے پاس مجتمع ہیں (بصرہ کے بلوائی انھیں خلیفہ بنانا چاہتے تھے)۔ اسی اثنا میں حضرت عثمان حضرت علی کے پاس آئے اور کہا: دینی حق کے علاوہ میں آپ پر بھائی چارہ، خونی رشتہ داری اور ازدواجی قرابت داری کے حقوق رکھتا ہوں۔ ان سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ہم زمانۂ جاہلیت میں بھی ہوتے تو بھی بنو عبد مناف کے لیے عار ہوتا کہ بنو تیم کا ایک فرد (یعنی حضرت طلحہ) ان کا حق چھین لے۔ حضرت علی نے کہا: ابھی آپ کو خبر مل جاتی ہے۔ چنانچہ وہ حضرت طلحہ کے گھر گئے اور امور خلافت میں دخل دینے کا سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا: مجبوری سے ایسا کیا ہے۔ پھر حضرت علی بیت المال گئے، اس کی کنجیاں نہ ملیں تو دروازہ توڑ کر لوگوں میں رقوم بانٹ دیں۔ اب لوگ حضرت طلحہ کے پاس سے چھٹ گئے، حضرت عثمان یہ خبر سن کر خوش ہوئے۔ پھر حضرت طلحہ حضرت عثمان کے پاس آئے اور کہا: امیر المومنین! میں نے ایک کام کرنا چاہا، لیکن اللہ کی طرف سے رکاوٹ آ گئی۔ حضرت علی نے حضرت طلحہ سے کہا: آپ فسادیوں کو عثمان سے ہٹنے کو نہیں کہہ سکتے؟ انھوں نے جواب دیا: جب تک بنو امیہ خود یہ حق نہیں دیتے۔

شہادت کے بعد خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان کی میت تین دن تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ حضرت حکیم بن حزام اور حضرت جبیر بن مطعم نے حضرت علی سے بات چیت کر کے تدفین کے انتظامات کیے۔ حضرت علی،

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت طلحہ، حضرت زید، حضرت کعب، حضرت حویطب بن عبد العزیٰ، حضرت ابو جہم بن حذیفہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت نیار بن مکرم اور دوسرے کئی صحابہ جنازے میں شریک ہوئے۔ حضرت علی نے بلوائیوں کو ان کے مکروہ ارادے سے باز کیا جو میت پر سنگ باری کرنا چاہتے تھے۔

حضرت علی سے سوال کیا گیا کہ حضرت عثمان کو قتل کرنے کا محرک کیا تھا؟ انھوں نے مختصر جواب دیا: حسد اس کا باعث تھا۔ فرماتے ہیں: بخدا! میں عثمان کی شہادت میں شامل ہوا نہ اس کا حکم دیا، لیکن میں مغلوب ہو گیا تھا۔ (مستدرک حاکم، رقم ۴۵۶۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۸۲۶)۔ اس بات کو انھوں نے ایک مثال سے واضح کیا۔ ایک جنگل میں ایک شیر اور سفید، سرخ اور سیاہ تین بیل رہتے تھے۔ بیلوں کے اتفاق کی وجہ سے شیر انھیں کھا نہ سکتا تھا۔ شیر نے سرخ اور سیاہ بیلوں سے کہا: اس سفید بیل کی وجہ سے ہمیں خطرہ ہے، کیونکہ اس کا رنگ ہر کسی کو نظر آ جاتا ہے۔ مجھے اس کا شکار کر لینے دو تو ہم مل جل کر رہیں گے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ اس نے سرخ بیل سے کہا: سیاہ بیل کی وجہ سے ہمارا جنگل خطرے میں ہے، کیونکہ یہ مشہور رنگ ہے۔ میرا اور تمھارا رنگ اتنے عام نہیں۔ مجھے اس کو کھا لینے دو تو جنگل ہمارا ہو جائے گا۔ اس کا کام تمام ہوا تو شیر نے سرخ بیل سے کہا: میں تمھیں کھانے لگا ہوں، لیکن اس سے پہلے میں تین آوازیں لگاؤں گا۔ بیل ناچار بولا: لگا لو۔ شیر پکارا: سرخ بیل کو میں نے اسی روز کھا لیا تھا جب سفید بیل کا شکار کیا تھا، سرخ بیل کو میں نے اسی روز کھا لیا تھا جب سفید بیل کا شکار کیا تھا، سرخ بیل کو میں نے اسی روز کھا لیا تھا جب سفید بیل کا شکار کیا تھا۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، سیرت النبی (شبلی نعمانی)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: مرتضیٰ حسین فاضل)، سیرت علی المرتضیٰ (محمد نافع)، اسمی المطالب فی سیرۃ علی بن ابی طالب (علی محمد صلابی)، wikipedia۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد تہامی بشر علوی

شکر گزاری کا مزاج

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کا مفہوم ہے کہ جو شخص بندوں کا شکر ادا نہیں کرتا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہیں کر سکتا[1]۔ شکر کا مزاج اصل میں پیدا ہوتا ہے، احساس کے ساتھ۔ یعنی آدمی میں خود پر ہونے والے انعامات محسوس کرنے کی اہلیت ہونی چاہیے۔

ایک انسان کی کوئی خدمت کر رہا ہو تو اس کی اتنی تربیت ضروری ہے کہ وہ دل میں اس کی اس خدمت کو محسوس کر سکے۔ یہی احساس پھر شکریے کے مزاج میں ڈھل جاتا ہے۔ جس آدمی میں یہ خوبی پیدا نہ ہو سکے، وہ شکر گزار انسان نہیں بن سکتا۔ اپنے اندر یہ احساس پیدا کرنے کے لیے انسان کو اپنے غور و فکر کے انداز کو درست کرنے کی ضرورت ہو گی۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی نوازشات کو بس اس زاویے سے دیکھے کہ کسی نے اس کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ آپ بازار میں جا کر چند روپے دے کر درجن کیلے لے آئے۔ دیکھنے میں آپ پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا، آپ نے رقم دی اور کیلے لائے قصہ ختم، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اگر کیلے آپ کی مارکیٹ تک لانے میں انسانوں کی خدمات شامل نہ ہوتیں، تو آپ کو اتنی آسانی اور سہولت سے یہ سب اپنی مارکیٹ میں کبھی نہ مل پاتا۔ لوگوں نے یہ سہولت پہنچانے کے لیے محنت کی، پھل کہیں اگا اور محنت کے مراحل سے گزر کر آپ کو اپنے بازار میں میسر ہو گیا۔ اس

۱۔ مسند احمد ۱۲، رقم ۷۵۰۴۔ 'مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ'۔

خدمت پر لوگوں نے چند روپے بھی ضرور کمائے، مگر دیکھیے کہ ان چند روپوں کے عوض آپ کے لیے کی گئی خدمت کتنی بڑی ہے۔ آپ لباس پہنیے اور یہ نہ سوچیے کہ ٹھیک ہے بس پیسے دے کر لے آیا، بلکہ سوچیے کتنے لوگوں کا تدبر اور محنتیں صرف ہونے کے بعد اتنا عمدہ لباس آپ کو پہننے کے لیے بہ آسانی میسر آ گیا۔ سوچنے کا یہ انداز شکر گزاری کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس دور میں تو انسانوں نے محنت کر کے ہمارے لیے سہولتوں کے انبار لگا کر رکھ دیے۔ یہ ان لوگوں کا شکریہ کہ ان لوگوں کی محنت سے ہم یہ سب سہولتیں اپنے کام میں لا رہے ہیں۔ لوگ دوبئی چلے جائیں تو ان کا حال احوال معلوم کرنا ہمارے لیے کتنا مشکل ہوتا تھا۔ انسانوں کے ہی دماغ کھپے اور آج ہم موبائل فون کی سہولت سے کتنا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کوئی کہیں بھی ہو آپ چند روپے صرف کر کے اس سے بہ آسانی بات کر سکتے ہیں۔

موبائل سے بات کرتے وقت ہمیں ان لوگوں کا شکر گزار رہنا چاہیے جن کی محنت سے ہمیں یہ سہولت میسر ہو رہی ہے، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کو سہولت فراہم کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ نہ ہم نے کبھی کسی ایجاد کا سوچا اور نہ سوچنے کا کوئی ارادہ ہے۔ لوگ مسلسل دماغ کھپا رہے ہے، محنتیں کر رہے اور ہر روز ہمارے لیے نئی نئی سہولتیں پیدا کر کے زندگی کی دشواریاں دور کر رہے ہیں۔ ہم جتنا ان سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں، یہ سہولتیں دینے والے لوگوں کے لیے دل سے شکر گزار بھی رہیں۔ جو لوگ کسی بھی قسم کی ہماری کوئی خدمت کر رہے ہیں، ہمیں ان کی خدمت کا احساس کر کے ان کا بہت شکر گزار رہنا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس وقت میں یہ گفتگو کر رہا ہوں تو یہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ اب ریکارڈنگ کے بعد یہ اس قابل ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا آدمی بھی اسے سن سکتا ہے، اسے دنیا کے کسی بھی حصے میں بھیجا جا سکتا ہے، وہاں بیٹھے لوگ آپ کی گفتگو سن سکیں گے۔ آپ کی بات کو دنیا کے ہر کونے تک پہنچانے کی سہولت ایسے ہی تو نہیں پیدا ہو گئی؟ یہ انسان کے برسوں کے تدبر کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اس کا احساس بھی کرنا ہو گا اور انسانوں کا شکر گزار بھی رہنا ہو گا۔

آج میں نے یہ جو لباس پہنا ہوا ہے، ہمیں اندازہ نہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ خود ہمارے بزرگ، دادا، پڑدادا اس قسم کے لباس سے محروم تھے۔ انسانوں نے یہ دور بھی دیکھا کہ بس جسم کے ساتھ کوئی کپڑا چپکایا اور کچھ کانٹے لگا دیے تاکہ وہ جسم کے ساتھ جڑے رہیں۔ اب تو ہم ایسے لباس کو پہننا تو چھوڑیے تصور میں لانا بھی مشکل سمجھتے ہیں۔ آج پہننے کے لیے یہ جو جوتے ہمیں میسر ہیں، یہ پہلے لوگوں کو میسر نہیں تھے۔ لوگ بعض اوقات گھاس کے جوتے بنا کر اور بعض لکڑی کے جوتے بنا کر گزارا کرتے تھے۔ اور اس میں بھی بہت زیادہ چلنا ممکن

نہیں ہوتا تھا۔ ایسے تکلیف دہ جوتوں سے تو لوگوں کے پاؤں زخمی ہو جایا کرتے تھے۔ اب دیکھیے کہ یہ لوگوں نے ہماری کتنی خدمت کر دی، انھوں نے محنت کی، دماغ استعمال کیے اور ہمارے پہننے کے لیے کئی اقسام کے نہایت عمدہ جوتے تیار کر لیے۔

یہ دیکھیے آج ہم اپنی آواز لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے دور دور تک پہنچا سکتے ہیں۔ پہلے یہ ممکن نہیں ہوتا تھا، لوگ خود جا جا کر کسی کو پیغام دیتے تھے۔ غور کیجیے تو ہمارے ارد گرد آج سہولتوں کا دریا بہ رہا ہے اور ہم جی بھر کے ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جن جن لوگوں کی محنتوں سے ہمیں یہ سب میسر ہوا، ہمیں ان کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ کچھ بھی نہیں تو کم از کم ہم غائبانہ ان کے لیے دعا تو کر سکتے ہیں کہ اے اللہ، جنھوں نے ہمارے لیے یہ سہولتیں اور یہ راحتیں پیدا کر لی ہیں، تو ہماری طرف سے ان کے لیے بھلائی فرما دے۔

ہم جب گھر جاتے ہیں تو آپ کو کھانا بالکل تیار ملتا ہے۔ پکانے کے لیے آپ نے گھر میں کوئی مشینیں تو نہیں فکس کی ہوئی ہوتیں، یہ آپ کی خدمت پر مامور خواتین ہوتی ہیں جو گھر میں یہ محنت کر رہی ہوتی ہیں اور عمر بھر آپ کی خدمت کر رہی ہوتی ہیں۔ وہ اٹھتی ہیں صبح سویرے، خود بعد میں کھاتی ہیں اور پہلے ہمارے کھانے کا بندوبست کرتی ہیں۔ ان کی محنت اور خدمت کا احساس کرنا ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔ غور کیجیے تو گھر کی یہ خواتین آپ کی کتنی خدمت کر رہی ہوتی ہیں، ان کی ان خدمات کا احساس کرنا اور پھر ان کا شکریہ ادا کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہمارے ہاں شکریہ ادا کرنے کی روایت سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ تو میں نے سنا ہے کہ کھانا اگر اچھا نہ ملے یا لیٹ ملے تو گالیاں بک دی جاتی ہیں، غصے میں الٹی سیدھی ہانک لی جاتی ہیں، یہ رواج تو ہمارے ہاں عام ہے، مگر اچھا کھانا وقت پر مل جانے پر شکریے کا کوئی رواج نہیں۔ آج جا کر آپ تلاش کرنا شروع کر دیں، کوئی ایسا خاوند مل سکے تو مجھے ضرور اس سے ملوائیں، جو اپنی بیوی کا شکریہ ادا کرتا ہو۔ یا جس نے کبھی کسی وجہ سے اپنی بیوی کا ایک بار ہی شکریہ ادا کیا ہو۔ کبھی بیوی سے کہا ہو: بیگم، آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے کھانا وقت پر دے دیا۔ ایسے لوگ ہمارے ہاں ناپید ہو چکے ہیں۔ کہیں احساس اور شکر گزاری کا مزاج دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ یہی مزاج ہماری خواتین کا بھی ہے۔ خاوند محنت مزدوری کر کے ان کے رزق کا بندوبست کرتا، ان کے لیے چیزیں خرید کر لاتا ہے، لیکن وہ کبھی زبان سے شکریہ کا لفظ تک ادا کرنے کو تیار نہیں۔ خاوند بیوی کا شکریہ ادا کرنے سے شرماتا ہے اور بیوی خاوند کو شکریہ کہنے سے ہچکچاتی ہے۔ ہمیں اور کچھ بھی نہیں تو کم از کم یہ احساس تو ضرور کرنا چاہیے

کہ ہمارے مزاج بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے احسانات اور خدمات کا احساس ہی اصل میں خدا کے احسانات کو محسوس کرنے کے قابل بناتا ہے۔ جسے آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے بندوں کی خدمات پر شکریہ ادا کرنا مشکل ہو، وہ اَن دیکھے خدا کے احسانات کو محسوس کیا کرتا ہو گا؟ وہ اس کا شکریہ ادا کیا کرتا ہو گا؟

خدا نے ہمیں وجود بخشا، زندگی عطا کی، دل، دماغ، آنکھ، کان، ہاتھ اور یہ سب نعمتیں بخشیں، تو ہمیں ان سے فائدہ اٹھاتے وقت خدا کا شکریہ تو ادا کرتے رہنا چاہیے۔ کیا ہم دیکھتے نہیں کہ ہمارے سامنے یہ جانور بڑی بڑی زبانیں رکھے ہوئے ہیں، وہ کبھی آپس میں یا آپ کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتے، وہ نہ مطالبہ رکھ سکتے ہیں، نہ کوئی شکایت کر سکتے ہیں۔ اِدھر ہمارے سامنے انسان کا ایک چھوٹا سا بچہ ہے، وہ گفتگو بھی کر رہا ہے، اپنی ضرورت کی چیزوں کا مطالبہ بھی کر رہا ہے، کبھی کہہ رہا ہے آج مجھے پنسل چاہیے، آج مجھے یہ چاہیے اور وہ چاہیے۔ ہم اپنی ضرورتیں، اپنی تکالیف اور شکایات زبان کے ذریعے سے پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے زبان بھی بخشی اور گفتگو کی صلاحیت بھی عطا کی۔

آج اگر ہم میں احساس و شکر گزاری کا یہ مزاج نہیں ہے تو ہمیں محنت سے اپنے مزاج ایسے بنانے پڑیں گے۔ صبح و شام گھر میں ہماری جو خدمت ہو رہی ہے، ہمارے دوست احباب ہماری کوئی خدمت کر رہے ہیں، ہمارے دکان دار ہماری خدمت کر رہے ہیں، کسی کی مہارت سے ہمیں بھی فائدہ پہنچ رہا ہے، ہم کسی سے علم سیکھ رہے ہیں، کوئی سیاسی خدمت کر رہا ہے یا کوئی مذہبی خدمت کر رہا ہے تو ہمیں ان سب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ہمیں گھر سے یہ عمل شروع کرنا ہو گا۔ بھائی بہنوں کے اور بہنیں بھائیوں کی شکر گزار بنیں۔ والدین اور اولاد ایک دوسرے کا شکریہ ادا کریں۔ میاں بیوی شکریے کا ماحول پیدا کریں۔ احساس اور شکر گزاری جس گھر کا نصیب بن جائے، یقین کیجیے وہ گھر بس جنت بن جاتا ہے۔ ہماری الجھنوں اور زندگی میں گھٹن کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے کا کوئی احساس ہی نہیں کرتے اور جب احساس نہیں کرتے تو شکریہ بھی ادا نہیں کرتے۔ ہمیں یہ عادت اپنانی چاہیے۔ اپنی نئی نسل کو اس کی تلقین کرنی چاہیے۔ ان کی تربیت میں ہم اس چیز کو شامل کریں تاکہ ہماری اس محنت سے ہماری آیندہ نسل شکر گزاروں کی نسل بن سکے۔ انسانوں کی اچھی تربیت میں ہم حصہ ڈال کر اپنے لیے صدقۂ جاریہ بنا سکتے ہیں۔ اور یہ کام بہت زیادہ مشکل بھی نہیں۔

برسوں سوکھی پھیکی زندگی جی جی کر ہم شکریہ کہنے سے شرما رہے ہیں۔ بس اس شرم سے ہمت کر کے لڑنا ہو گا اور اس معاملے میں تھوڑا بے شرم سا بننا پڑے گا۔ جب ایک بار یہ جھوٹی شرم راستے سے ہٹ گئی تو پھر ہمیں

شکریہ ادا کرنے میں شرم محسوس نہیں ہو گی، بلکہ شکریہ ادا نہ کر کے ہمیں شرمندگی کا احساس ہو گا۔ پروردگار ہمیں معاف فرمائے کہ ہم عمدہ اخلاق سے اور اچھائیوں سے نامانوس ہوتے ہوتے اب ان سے شرمندہ بھی ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے ایک کالج میں طلبا سے پوچھا: آپ میں سے کوئی بندہ بتائے جس نے کبھی اپنی ماں یا بہن کو شکریہ کا لفظ بولا ہو؟ یقین کیجیے کوئی ایک لڑکا بھی ایسا موجود نہیں تھا۔ پھر میں نے پوچھا: آپ میں کوئی ایسا ہے جس نے کبھی ماں یا بہن سے غصے میں بات نہ کی ہو؟ اس سوال کے جواب میں بھی کوئی لڑکا سامنے نہ آ سکا۔ احباب! یہ محض اس کلاس کے طلبا کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اللہ ہمیں معاف فرمائے، مجموعی طور پر ہمارا مزاج ہی اس قسم کا بن گیا ہے۔

ہم ناشکری کی طبیعت لے کر اس دنیا میں رہیں گے تو بس ایک مصیبت بن کر ہی رہیں گے، اور اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو یہ بھی ہمارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہو گی۔ ہمیں خدا اور اس کے بندوں کا شکر گزار بن کر جینا چاہیے۔ ایک مہذب انسان کی زندگی اس کے سوا نہیں ہو سکتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified
ISO 9001 : 2000

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk
Tel: 021-38682810

Monthly
ISHRAQ
Lahore

July 2019
Vol.31 No.07
Regd No.CPL-183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

لئن شکرتم لازیدنکم
اگر شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا (القرآن)

PRAISE BE TO ALLAH, LORD OF THE WORLDS

Ar-Rahman Campus-JHELUM
Outside Classroom Education
Inter-Campus Transfer
Sahi Campus-SHAHKOT
Al-Fajar Campus-LAHORE
Ghazi Campus-OKARA
Grace Campus-LAHORE
Gojra Campus-GOJRA
Lodhran Campus-LODHRAN
Bhimber Campus-BHIMBER
Shakargarh Campus-SHAKARGARH
Rehman Campus-GUJRANWALA
Pak Campus-LAHORE
Web Portal
Standardized Curriculum
Shahlimar Campus-FAISALABAD
Sahiwal Campus-SAHIWAL
Parent-Teacher Meetings
Entry Test Preparation
Harbanspura Classic Campus-LAHORE
DC Road Campus-GUJRANWALA
Ali Pur Chattah Campus-ALI PUR CHATTAH
Sialkot Campus-SIALKOT
Al-Miraj Campus-LAHORE
Al-Ahmad Campus-LAHORE
Bahawalpur Campus-BAHAWALPUR
Sibling Discount
Sir Syed Campus-LAHORE
Mock Assessment
Educational Insurance
Capital Campus-ISLAMABAD
Ellahabad Campus-ELLAHABAD
Cantt Campus-GUJRANWALA
Ferozpur Road Campus-LAHORE
Tulip Campus-LAHORE
Raiwand Road Campus-LAHORE
Sargodha Road Campus-FAISALABAD
Satellite Town Campus-GUJRANWALA
Farooqabad Campus-FAROOQABAD
Bilal Campus-BHALWAL
Professional Development of Teachers
Marrium Campus-JOHARABAD
Jhelum Campus-JHELUM
Zafarwal Campus-ZAFARWAL

150+ within 250 days keep counting...

Spoken English
Attendance by SMS
Character Building

ALLIED SCHOOLS
Project of Punjab Group of Colleges

Concept-Based Teaching
Wapda Town Campus-GUJRANWALA
Exclusive Early Years Education
Satellite Town Campus-RAWALPINDI
GT Road Campus-GUJRANWALA
Burewala Campus-BUREWALA
Kamalia Campus-KAMALIA
Husnain Campus-SAMBRIAL
Extra & Co-curricular Activities
Bedian Campus-LAHORE
Ar-Raheem Campus-DINA
Walton Campus-LAHORE
Peshawar Road Campus-RAWALPINDI

Allied Pre School
Allied School
1985 Project of PGC

Johar Town Campus (South)-LAHORE
Gulshan-e-Ravi Campus-LAHORE
Merit Scholarships
Samanabad Campus-LAHORE
Sadar Campus-LAHORE
Career-Path Counseling
Akbar Campus-VEHARI

Growing Together

Hyderabad Campus-HYDERABAD
Samanabad Campus-FAISALABAD
Chauburji Campus-LAHORE
Sargodha Campus-SARGODHA
Kamoke Campus-KAMOKE
Peoples Colony Campus-FAISALABAD
Hafizabad Campus-HAFIZABAD
Dunyapur Campus-DUNYAPUR
Chichawatni Campus-CHICHAWATNI
Wazirabad Campus-WAZIRABAD
Subhan Campus-PATTOKI
PECO Road Campus-LAHORE
Art, Craft & Music
Allama Iqbal Town Campus-LAHORE
International Standards
Peoples Colony Campus-GUJRANWALA
Kasur Campus-KASUR
Al-Fateh Campus-KOT ABDUL MALIK
Dinga Campus-DINGA
Johar Town Campus (North)-LAHORE
Kotla Campus-KOTLA ARAB ALI KHAN
Thana Campus-MALAKAND AGENCY
Ahmed Campus-RAHIM YAR KHAN
Faisalabad Campus-FAISALABAD
Muridke Campus-MURIDKE
Swat Campus-SWAT
Lalamusa Campus -LALAMUSA
Madina Campus-FAISALABAD
Salaar Campus-RAWALPINDI
Teaching through Animation
Fatima Campus-DASKA
Adyala Campus-RAWALPINDI
Oasis Campus-BAHAWALPUR
Taunsa Campus Campus-TAUNSA SHARIF
Mumtaz Campus-MULTAN
Health & Hygiene Guidance
Rahim Yar Khan Campus-RAHIM YAR KHAN
English Medium
Jalal Pur Jattan Campus-JALAL PUR JATTAN
Bukhtiyari Campus-LAHORE
Narowal Campus-NAROWAL
Jinnah Campus-NOWSHERA VIRKAN
Malakwal Campus-MALAKWAL
Sadiqabad Campus-SADIQABAD
DG Khan Campus-DERA GHAZI KHAN
Gujrat Campus (South)-GUJRAT
Mirpur Campus-MIRPUR AZAD KASHMIR
Playgroup to University Education
Quaid Campus-TOBA TEK SINGH
Model Town Campus-GUJRANWALA
Mandi Bahauddin Campus-MANDI BAHAUDDIN
Mouaz Campus-MANANWALA
Al-Ghaffar Campus-SARA-E-ALAMGIR
Chanab Campus-PARHIANWALI
Bhakkar Campus-BHAKKAR
Qila Didar Singh Campus-QILA DIDAR SINGH
Zalmas Campus-SHEIKHUPURA
Hujra Shah Muqeem Campus-HUJRA SHAH MUQEEM

Group Corporate Office, Allied Schools & Punjab Colleges. 64-E-I, Gulberg III, Lahore - Pakistan. Ph: 042 35756357-58.

www.alliedschools.edu.pk